Missing: 26-27, 56-57
Repeated: 40-41

کیا حدیث حجت نہیں؟

بقلم

حبیب الرحمٰن اعظمی

استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

ناشر

مرکز دعوت و تحقیق دیوبند سہارنپور یوپی

نام کتاب : کیا حدیث حجت نہیں؟

مولف : حبیب الرحمٰن اعظمی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

سن اشاعت : ۱۴۳۱ھ — ۲۰۱۰ء

ناشر : مرکز دعوۃ وتحقیق دیوبند سہارنپور یوپی

تقدیم

از حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب

استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند زید مجدہٗ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین، وعلی آلہ وصحبہ اجمعین.

امابعد! حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کا رسالہ ''کیا حدیث حجت نہیں؟'' یہ ایک فاضل محقق کی تحریر ''حدیث اور سنت میں فرق اور حجت سنت ہے حدیث نہیں'' کا علمی جائزہ ہے، جس میں انھوں نے فاضل مذکور کی غلط فہمیوں کا پردہ چاک کیا ہے، جس کو انھوں نے اگرچہ ایک طالب علمانہ جائزہ کہا ہے، لیکن درحقیقت وہ ایک عالمانہ ومحققانہ جائزہ ہے، اور کمال یہ ہے کہ ان کا قلم کہیں بھی حدِّ اعتدال سے خارج نہیں ہوا ہے، جبکہ اس طرح کی مناقشاتی تحریروں میں عام طور پر لکھنے والوں کے قلم جادۂ اعتدال پر قائم نہیں رہ پاتے ہیں۔

میری رائے میں اگر مولانا اعظمی صاحب حاصل بحث کے طور پر فاضل موصوف کے مقالہ میں درآئی غلطیوں کا ترتیب وار تذکرہ کردیتے تو زیادہ مناسب ہوتا اس سے ہر قاری ایک نظر میں سمجھ جاتا کہ فاضل محقق استنباط مسائل کیلئے سب سے الگ ایک منہاج مقرر کرنا چاہتے ہیں، جبکہ اس طرح کے منہاج وضع کرنے کی فی زمانناکسی کے اندر صلاحیت نہیں ہے۔ اور عدم صلاحیت کے باوجود اس پر اقدام کرنے والے کے بارے میں شاطبی نے الاعتصام، ج:۲، ص:۱۷۲ میں جو تفصیل پیش کی ہے اسے دیکھ لیا جائے۔

حدیث وسنت مطلقاً بلا کسی شرط کے حجت ہیں، اس لئے کہ حجیت کی بنیاد رسول معصوم ﷺ سے اس کا محض صدور ہے لہٰذا اس کی حجیت کو یوں مشروط کرنا کہ اگر حدیث سے سنت فقہی کا ثبوت ہو رہا ہے، تو حجت اور اگر سنت فقہی کا ثبوت نہیں تو حجت نہیں۔ جیسا کہ فاضل موصوف نے اپنی اس تحریر میں کہا ہے، تو یہ بھی انکار حجیت حدیث میں داخل ہے۔ مسلّم کے شارح لکھتے ہیں "لان بعد اعتقاد صدوره عمن لاينطق عن الهون لا معنى لنفى الحجيه" ج:۲،ص:۹۷۔ اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ حجیت حدیث کا اقرار ضروریات دین سے ہے۔

(۱) فاضل محقق جب حجیت حدیث یا حجیت سنت کی بحث کر رہے ہیں تو سب سے پہلے حجیت کے مفہوم کو متعین کرنا چاہئے تھا کیونکہ اس کے متعین ہو جانے کے بعد دوسرے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہونے سے بچ جاتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

(۲) فاضل موصوف جب حجیت حدیث یا حجیت سنت کی بحث کر رہے ہیں تو اس حدیث وسنت سے مراد بالاتفاق ما صدر عن النبى صلى الله عليه وسلم قولاً، او فعلاً او تقريرًا ہے، اس معنی میں متقدمین ومتاخرین نے حدیث وسنت میں ترادف نقل کیا ہے، جس کو امام نووی وغیرہ محققین علماء سے جائزہ میں تفصیل سے نقل کیا گیا ہے، موجودہ دور کے علماء عبدالفتاح ابوغدہ وغیرہ، نیز الموسوعة الفقهية الكويت میں بھی یہی مذکور ہے۔ اس موقع پر اس معنی کے علاوہ حدیث وسنت کا کوئی اور مفہوم ہو ہی نہیں سکتا ہے کیونکہ حجیت کی صلاحیت یعنی حکم خداوندی کا مظہر بننا اسی قول وفعل وتقریر نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی کے لئے ممکن ہے، رہا حدیث کی تعریف میں صفات واحوال رسول ﷺ کا اضافہ تو حضرات محدثین نے یہ اپنے فن اور موضوع کے لحاظ سے کیا ہے۔

اسی طرح اردو میں بھی جب حجیت حدیث یا حجیت سنت بولا جاتا ہے اور جن علماء نے اس نام سے کتابیں لکھی ہیں اسی طرح مشکوٰۃ اور دورۂ حدیث کی کتابوں کے درس کی ابتداء میں جب اساتذہ حجیت حدیث سے بحث کرتے ہیں تو سب حدیث وسنت سے یہی مراد بیان کرتے ہیں۔ جبکہ فاضل موصوف نے حدیث کی تعریف تو اسی معروف

ومتداول الفاظ سے کی ہے اور سنت کی الگ یعنی "الطريقة المسلوكة" کے الفاظ سے تعریف کی ہے، حالانکہ کسی محدث، فقیہ اور اصولی نے حجیت کے باب میں سنت کی یہ تعریف نہیں کی ہے۔ پھر اس طریقۂ مسلوکہ کی کوئی تشریح اور اس کا کوئی مفہوم بھی بیان نہیں کیا ہے۔

زیر نظر رسالہ میں اس مسئلہ کی پوری توضیح وتشریح کی گئی ہے، جس سے فاضل محقق کی غلط فہمی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

(۳) وہ احکامات جو نبی علی الصلوٰۃ والسلام کی خصوصیت کے قبیل سے ہیں، فاضل موصوف نے انھیں الطريقة المسلوكه سے خارج کر دیا ہے اور جن دلائل سے وہ خصوصی احکام ثابت ہیں انھیں حدیث کہہ کر حجیت سے نکال دیا ہے، تو کیا آنحضور ﷺ کا بطور خاص حضرت خزیمہ کی صرف ایک شہادت کو دو شہادتوں کے قائم مقام قرار دینا، ایک خاص صحابی کو بکری کے بچہ کی قربانی کی اجازت دینا، اسی طرح بعض وہ احکام جو مردوں کے لئے خاص ہیں عورتوں کو ان کا کرنا جائز نہیں، اور بعض وہ احکام جو عورتوں کے حق میں خاص ہیں، مرد انھیں نہیں کر سکتے یہ سب الطريقة المسلوكة سے خارج ہو جائیں گے اور جن دلائل سے یہ ثابت ہیں وہ حجت نہیں ہوں گے؟

آج تک کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ حکم شرعی یا دلیل شرعی کے لئے اس کا عام ہونا ضروری ہے، لہٰذا کسی فردِ مکلّف کے ساتھ کسی حکم کی تخصیص اس کے حکم شرعی ہونے سے مانع نہیں ہوگی اور نہ وہ دلائل جن سے یہ احکام ثابت ہیں غیر حجت ہوں گے بلکہ کسی کے ساتھ خاص ہونے کا صرف یہ مطلب ہے کہ اس پر دوسروں کا قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے۔

(۴) نیز فاضل محقق نے سنت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی حجیت کے لئے جو حدیث پیش کی ہے، بربنائے تخصیص وہ بھی ان کی تحریر کے بموجب الطريقة المسلوكه میں داخل نہیں ہوگی اور سنت کی بجائے حدیث ہی ہوگی تو وہ اس حدیث سے حضرات خلفاء اربعہ کی سنت کی حجیت کس طرح ثابت کر رہے ہیں، الغرض فاضل محقق نے حدیث کی حجیت کے سلسلہ میں یہ جو نئی راہ ایجاد کی ہے اس میں وہ خود تضاد کے

شکار ہیں، اس لئے جائزہ نویس کا یہ کہنا کہ موصوف کی یہ تحریر وہم وایہام کا ایک مجموعہ ہے بالکل درست ہے، میں نے زیرنظر جائزہ کو مکمل دیکھا ہے اس میں مذکور جملہ مباحث مدلل اور مستند ہیں اور نہایت مناسب وسنجیدگی کے ساتھ فاضل محقق کی علمی وفکری غلطیوں کو واضح کردیا ہے فجزاهُ الله عن العلم والعلماء خير جزاء. اللّٰهم ارنا الحق حقًا وارزقنا اتباعه، ارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه، والصلوٰة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله واصحابه اتباعه اجمعين.

(حضرت مولانا) نعمت اللہ (صاحب)
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند
۱۸ر شوال المکرّم ۱۴۳۱ھ

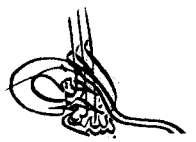

الحمد لله رب العالمين، الذي شرّع لنا أحكامهُ، وارسل إلينا رسوله سيدنا وسندنا محمدًا صلى الله عليه وسلم بالهدى ودين الحق ليبيّن للناس ما نزّل إليهم، أما بعد:

حجیت حدیث وسنت

کتاب وسنت یعنی قرآن وحدیث ہمارے دین ومذہب کی اولین اساس وبنیاد ہیں، پھران میں کتاب الٰہی اصل اصول ہے اوراحادیث رسول اس کی تبیان وتفسیر ہیں۔ خدائے علیم وخبیر کا ارشاد ہے "وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ" (الآية) اورہم نے اتارا آپ کی طرف قرآن؛ تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اسے خوب واضح کردیں۔

فرمان الٰہی سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا مقصد عظیم قرآن محکم کے معانی ومراد کا بیان اور وضاحت ہے، آپ ﷺ نے اس فرض کو اپنے قول وفعل وغیرہ سے کس طور پر پورا فرمایا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اسے ایک مختصر مگر انتہائی بلیغ جملہ میں یوں بیان کیا ہے "كان خلقه القرآن" یعنی آپ کی برگزیدہ ہستی مجسم قرآن تھی، لہٰذا اگر قرآن حجت ہے (اور بلاریب وشک حجت ہے) تو پھراس میں بھی کوئی تردد وشبہ نہیں ہے کہ اس کا بیان بھی حجت ہوگا، آپ نے جو بھی کہا ہے، جو بھی کیا ہے، وہ حق ہے، دین ہے، ہدایت ہے، اور نیکی ہی نیکی ہے، اس لئے آپ

کی زندگی جو مکمل تفسیر کلام ربانی ہے آنکھ بند کر کے قابل اتباع ہے "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" خدا کا رسول تمہارے لئے بہترین نمونہ عمل ہے، علاوہ ازیں آپ ﷺ کو خدائے علی وعزیز کی بارگاہ بے نہایت سے رفعت وبلندی کا وہ مقام بلند نصیب ہے کہ ساری رفعتیں اس کے آگے سرنگوں ہیں حتی کہ آپ کے چشم وابرو کے اشارے پر بغیر کسی تردد وتوقف کے اپنی مرضی سے دستبردار ہوجانا معیار ایمان واسلام ٹھہرایا گیا ہے۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ کسی مومن مرد وعورت کو گنجائش نہیں ہے جب اللہ اور اس کا رسول کوئی حکم دے تو پھر ان کے لئے اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے۔ ربّ علیم وعزیز کی ان واضح ہدایات کے بعد بھی کیا کسی کو یہ حق پہنچ سکتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال وافعال میں اپنی جانب سے تقسیم وتفریق کرے کہ یہ ہمارے لئے حجت ہے، اور یہ حجت نہیں ہے۔

نیز رسولِ خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

الا انی أُوتیت الکتاب ومثله معهٗ الا یوشِكُ رجلٌ شَبعَانُ علی اریکته یقول: علیکم بهذا القرآن، فما وجدتم فیه من حلال فاحلّوه، وما وجدتم فیه من حرام فحرّموه، الا لا یحلّ لکم الحمار الاهلی، ولا ذی ناب من السبع، ولا کل ذی مِخلب من الطیر" الحدیث (رواه ابوداؤد في السنن في کتاب السنة والاطعمة)(۱)

بغور سنو! مجھے اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرآن دیا گیا ہے، اور قرآن کے ساتھ قرآن ہی جیسی (یعنی حدیث وسنت بھی) دی گئی ہے، خبردار رہو! قریب ہے کہ کوئی آسودہ حال

(۱) یہ حدیث بہت سی کتب حدیث میں بایں الفاظ مروی ہے:

عن المقدام بن معدی کرب الکندی، اَنّ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم حرّم اشیاء یوم خیبر: الحمارَ وغیره ثم قال: یوشك الرجل متکئاً علی اریکته یُحدّث بحدیثی فیقول بیننا وبینکم کتاب اللّٰه ما وجدنا فیه من حلال استحللناه وما وجدنا فیه من حرام حرمناه، الا وان ما حرّم رسول اللّٰه فهو مثل ما حرّم اللّٰه (سنن الدارمی باب السنة قاضیة علی کتاب اللّٰه ج:۱، ص:۱۵۲)

شخص اپنی آراستہ سیج پر بیٹھا کہے گا، اسی قرآن کو لازم پکڑو پس جو چیز اس میں از قبیل حلال پاؤ اسے حلال جانو، اور جو اس میں از قبیل حرام پاؤ اسے حرام جانو، خبردار تمہارے لئے گھریلو گدھا حلال نہیں ہے اور نہ ہی شکاری درندہ اور نہ ہی شکاری پرندہ حلال ہے (حالانکہ صراحت سے ان جانوروں کے حرام ہونے کا ذکر قرآن میں نہیں ہے)

اس حدیث سے درج ذیل امور معلوم ہوئے:

(الف) قرآن ہی کی طرح احادیث بھی منجانب اللہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دی گئی ہیں، (ب) قرآن کی طرح احادیث بھی احکام میں حجت ہیں، (ج) اور قرآن ہی کی طرح ان کی اتباع اور ان پر عمل لازم ہے۔

قرآن وحدیث کی ان تصریحات کے مطابق، حضرات صحابہ، تابعین، محدثین، فقہائے مجتہدین اور تمام علماء اہل سنت والجماعت حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حجیت اور اس کی تشریعی حیثیت پر بصیرتؑ کے ساتھ یقین رکھتے ہیں، اہل اسلام کے کسی گروہ، یا فرد نے جب کبھی بھی حدیث پاک کی اس شرعی حیثیت پر ردوقدح کی ہے تو اسے یکسر مسترد کر دیا گیا ہے۔

غرضیکہ علماء حق کا یہی جادۂ متوارثہ ہے۔ اپنے تمام اساتذہ کو بھی اسی موقف پر پایا، اور اب تک اس موضوع پر جن کتابوں کے مطالعہ کی توفیق ملی وہ تقریباً ایک درجن سے زائد ہیں ان میں صرف فرقہ قرآنیہ کے بعض مصنفین کی دو ایک کتابوں کے علاوہ سب میں قابل قبول قوی دلائل کے ساتھ حجیت حدیث کے مذہب منصور کا اثبات اور تائید وتوثیق کی گئی ہے۔ بایں ہمہ ایک ہم عصر مشہور فاضل نے جو اپنی وسیع علمی خدمات کی بنا پر اوساط علمیہ میں اعتبار واستحسان کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اپنی ایک تحریر میں اس بارے میں میرے علم کے مطابق سب سے الگ ایک جدید نقطۂ نظر پیش کیا ہے جو انھیں کے الفاظ میں یہ ہے کہ "حدیث اور سنت میں فرق (ہے) اور حجت سنت ہے حدیث نہیں" زیر نظر تحریر میں اسی نقطۂ نظر کا اپنے علم وفہم کے مطابق جائزہ لیا گیا ہے۔

واللّٰه هو الملهم الصواب والسداد، وعلیه التکلان والاعتماد.

(الف) سنت کا لغوی معنی

۱-امام لغت مطرزی متوفی ۶۱۰ھ "لفظ سنن" کے تحت لکھتے ہیں:

"السنة" الطريقه ومنها الحديث في مجوس هَجَر "سنّوا بهم سنّة اهل الكتاب" اى اسلكوا بهم طريقهم يعنى عاملوهم معاملة هؤلاء في اعطاء الامان باخذ الجزية منهم. (المغرب، ج:۱،ص:۴۱۷)

"سنت" طریقہ کے معنی میں ہے اسی معنی میں مجوسِ ہجر کے بارے میں حدیث ہے "سنّوا بهم سنة اهل الكتاب" ان مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب جیسا طریقہ اختیار کرو یعنی جزیہ لے کر امن دینے کا جو معاملہ اہل کتاب کے ساتھ کرتے ہو یہی معاملہ ان مجوسیوں کے ساتھ کرو۔

۲-امام محی الدین ابوزکریا نووی متوفی ۶۷۶ھ لفظ "السنۃ" کے تحت رقمطراز ہیں:

"سنة النبي صلى الله عليه وسلم أصلها الطريقه، وتطلق سنته صلى الله عليه على الأحاديث المروية عنه صلى الله عليه وسلم، وتطلق السنة على المندوب، قال جماعة من أصحابنا في أصول الفقه: السنة، والمندوب، والتطوع، والنفل، والمرغب، والمستحب كلها بمعنى واحد وهو ما كان فعله راجحاً على تركه ولا إثم على تركه" (تہذیب الاسماء واللغات، ج:۳،ص:۱۵۶)

سنت کا اصل معنی طریقہ ہے اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ اصطلاحاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی احادیث پر بولا جاتا ہے نیز سنت کا اطلاق امر مستحب پر بھی ہوتا ہے ہمارے شوافع فقہائے اصول کی ایک جماعت کا قول ہے کہ سنت، مندوب، تطوع، نفل، مرغّب، اور مستحب یہ سب الفاظ ایک معنی میں ہیں یعنی وہ فعل جس کا کرنا نہ کرنے پر راجح ہے اور اسے چھوڑ دینے پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

۳-ماہر لغت ابن المنظور متوفی ۷۱۱ھ اپنی گرانقدر تصنیف "لسان العرب" میں لکھتے ہیں:

وقد تكرر في الحديث ذكر السنة وما تصرّف منها، والأصل فيه الطريقة، والسيرة، واذا اطلقت في الشرع فإنما يراد بها ما أمر به النبي صلى الله عليه وسلم ونهى عنه وندب إليه قولاً وفعلاً مما لم ينطق به الكتاب العزيز ولهذا يقال في أدلة الشرع الكتاب والسنة أي القرآن والحديث (فصل السين حرف النون، ج:۱۷،ص:۸۹)

سنت اور اس کے مشتقات کا ذکر حدیث میں بار بار آیا ہے، اس کا اصل معنی طریقہ اور چال چلن کے ہے، اور شرع میں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ کام لیا جاتا ہے جس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا، یا جس سے منع کیا، یا جس کی اپنے قول وفعل کے ذریعہ دعوت دی جن کے بارے میں کتاب عزیز نے (صراحت) سے کچھ نہیں کہا ہے، اسی بناء پر دلائل شرعیہ (کے بیان) میں کہا جاتا ہے "الكتاب والسنة" یعنی "قرآن وحدیث"۔

علامہ ابن المنظور کے کلام میں "ما أمر به النبي صلى الله عليه وسلم ونهى عنه" عام ہے جس میں امر وجوبی، وغیر وجوبی اور نہی تحریمی وغیر تحریمی سب داخل ہوں گی۔

۴-المعجم الوسیط مادہ سنن میں ہے:

السَّنَن' الطريقة والمثال يقال بنوا بيوتهم على سنن واحد... والسنة الطريقة والسيرة حميدة كانت او ذميمة، وسنة الله حكمه في خليقته، وسنة النبي صلى الله عليه وسلم: ما ينسب إليه من قول او فعل او تقرير، "وفي الشرع" العمل المحمود في الدين مما ليس فرضاً ولا واجباً" (ص:۴۵۶)

سنن طریقہ اور مثال کے معنی میں ہے اسی معنی میں بولا جاتا ہے "بنوا بيوتهم على سنن واحد" یعنی اپنے گھروں کو ایک طریقہ اور ایک نمونہ پر بنایا... اور سنت بمعنی طریقہ اور طرز زندگی ہے یہ طریقہ خواہ محمود ہو یا مذموم، اور "سنت اللہ" کا معنی اللہ کا اپنی مخلوق کے متعلق فیصلہ کے ہیں، اور سنت رسول سے مراد وہ قول وفعل اور تقریر ہیں جو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہیں، اور فقہ میں یہ لفظ دین میں اس پسندیدہ عمل پر بولا جاتا ہے جو فرض واجب نہیں ہیں۔

(ب) حدیث کا لغوی معنی

۱-لسان العرب میں ہے:

الحديث نقيض القديم... والحديث كون الشيء لم يكن، ... والحديث الجديد من الاشياء، والحديث الخبر يأتي على القليل والكثير والجمع أحاديث (ج:۲،ص:۴۳۶،۴۳۸،فصل الحا،حرف الثا،)

حدیث قدیم کا نقیض (یعنی مقابل مخالف) ہے، حدیث شئ کا ہوجانا جو پہلے نہیں تھی، بمعنی جدید اور نئی، بمعنی خبر خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر، اور جمع احادیث ہے۔

۲-ابن سیدہ متوفی ۴۵۸ھ المخصص میں لکھتے ہیں:

الحديث الخبر، وقال سيبويه: والجمع أحاديث. (ج:۳،ص:۳۲۳)

حدیث کے معنی خبر کے ہیں اور سیبویہ نے کہا ہے کہ اس کی جمع احادیث ہے۔

۳- علامہ قاضی محمد اعلیٰ تھانوی متوفی ۱۱۹۱ھ کشاف اصطلاحات الفنون میں لکھتے ہیں:

الحديث لغة ضد القديم ويستعمل في قليل الكلام و كثيره (۲۷۹)

حدیث قدیم کا ضد ہے، اور کلام قلیل وکثیر میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

۴-علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۳ھ لکھتے ہیں:

كل كلام يبلغ الإنسانَ من جهة السمع او الوحي في يقظته أو منامه يقال له حديث. قال عزّ وجلّ: "وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حديثًا (التحریم:۳،مفردات الفاظ القرآن،ص:۱۲۴)

ہر وہ کلام جو انسان تک پہنچتا ہے کان کی جانب سے یا وحی کی جانب سے بیداری یا خواب کی حالت میں اسے حدیث کہا جاتا ہے۔ اللہ عزّ وجلّ کا ارشاد ہے: واذ اَسرّ

النبیّ" الآیة اور جب کہ کہی نبی نے اپنی بعض بیوی سے ایک بات۔

علمائے لغت کی مندرجہ بالا عبارتوں سے معلوم ہوا کہ "حدیث" از روئے لغت، جدید، غیر موجود کا وجود میں آجانا، خبر اور کلام یعنی بات کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

سنت وحدیث کی اس لغوی معنوی تحقیق کے بعد ان ہر دو کی اصطلاحی تعریف ملاحظہ کیجئے، جس کے تحت علمائے حدیث، علمائے اصول فقہ، اور فقہ حنفی کی الگ الگ تعریفات نقل کی جارہی ہیں؛ تاکہ مسئلہ زیر بحث میں ہر جماعت وطبقہ کی اصطلاحات سامنے رہیں اور خلط مبحث سے بچا جاسکے۔ سب سے پہلے حدیث کی تعریف محدثین کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔

حدیث محدثین کی اصطلاح میں

شیخ ابوالفیض محمد بن محمد فارسی حنفی المعروف بہ فصیح ہروی متوفی ۸۳۷ھ اپنی مفید تصنیف جواہر الاصول میں حدیث کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

۱- "الحديث، وهو في اللغة ضد القديم، ويستعمل في قليل الكلام وكثيره، وفي اصطلاحهم: قول رسول الله صلى الله عليه وسلم وحكاية فعله وتقريره والسنة ترادفه عندهم" (ص:۱۰)

لغت میں حدیث قدیم کا ضد ہے، اور تھوڑی وزیادہ بات پر بھی حدیث کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اور محدثین کی اصطلاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور آپ ﷺ کے فعل وتقریر کی حکایت وبیان حدیث ہے، ان حضرات کے نزدیک سنت، حدیث کے مرادف ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ صحیح بخاری کے باب الحرص علی الحدیث کے تحت لکھتے ہیں:

۲ - "المراد بالحديث في عرف الشرع ما يضاف إلى النبي صلى الله عليه وسلم وكأنّه أريد به مقابلة القرآن لأنه قديم" (فتح الباری،ج:۱،ص:۲۵۷)

حدیث سے مراد شرعی و دینی عرف و اصطلاح میں وہ امور ہیں، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہیں، "ما یضاف إلی النبیؐ" میں حافظ عسقلانیؒ نے جس عموم کی جانب اشارہ کیا تھا، ان کے تلمیذ رشید حافظ سخاوی نے اپنی ذکر کردہ تعریف میں اسی کی تشریح و توضیح کی ہے۔ ''واللہ اعلم''

۳- حافظ سخاوی متوفی ۹۰۲ھ ''حدیث'' کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں:

"الحديث" لغة ضد القديم، واصطلاحاً: ما أضيف إلى النبي صلى الله عليه وسلم قولاً له أو فعلاً، أو تقريرًا أو صفةً حتى الحركات والسكنات في اليقظة والمنام، فهو أعمّ من السنة... وكثيراً ما يقع في كلام أهل الحديث - ومنهم الناظم - ما يدل لترادفهما" (فتح المغیث، ج:۱،ص:۹)

حدیث لغت میں حادث و نو پید کے معنی میں ہے اور اصطلاح محدثین میں حدیث وہ سب چیزیں ہیں جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانب منسوب ہیں (یعنی) آپ ﷺ کا قول، یا فعل، یا آپ کا کسی امر کو ثابت اور برقرار رکھنا، یا آپ کی صفات؛ حتی کہ بیداری اور نیند میں آپ کی حرکت و سکون (یہ سب حدیث ہیں لہٰذا اس تعریف کی رو سے یہ سنت سے عام ہے، (جبکہ) علمائے حدیث (جن میں ناظم یعنی الفیۃ الحدیث کے مصنف حافظ عراقی متوفی ۸۰۶ھ بھی ہیں) کا کلام کثرت سے یوں واقع ہوا ہے، جو حدیث وسنت کے ترادف اور ایک ہونے کو بتا رہا ہے۔

نادرۂ روزگار علامہ عبدالحئی فرنگی محلیؒ متوفی ۱۳۰۴ھ حدیث کی تعریف پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۴ - واختلف عباراتهم في تفسير الحديث، فقال بعضهم: ما أضيف إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم قولاً أو فعلاً أو تقريرًا، أو إلى الصحابي، أو إلى التابعي، وحينئذ فهو مرادف السنة، وكثيرا ما يقع في كلام الحفاظ ما يدل على الترادف. وزاد بعضهم أو صفة، وقيل رُوياء أيضاً بل الحركات والسكنات النبوية في المنام واليقظة أيضاً، وعلى هذا فهو أعم من السنة

(ظفر الامانی مع تعلیق علامہ شیخ ابوغدہ، ص:۲۴)

حدیث کی تفسیر و تعریف میں حضرات محدثین کی عبارتیں مختلف ہیں، بعض محدثین یوں تعریف کرتے ہیں وہ قول یا فعل یا تقریر جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہیں یا صحابی یا تابعی کی طرف ان کی نسبت ہے (وہ حدیث ہے) اس تعریف کی رو سے حدیث، سنت کے مرادف ہوگی اور حفاظ حدیث کے بکثرت کلام و تصرفات دونوں کے مرادف ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

اور بعض محدثین نے حدیث کی تعریف میں آنحضرت ﷺ کی صفات، اور خوابوں کا بھی؛ بلکہ بحالت نوم یا بیداری آپ کے حرکات و سکنات کا اضافہ کیا ہے؛ لہٰذا ان کی تعریف کے لحاظ سے حدیث میں سنت کے اعتبار سے وسعت و عمومیت ہوگی۔

سنت محدثین کی اصطلاح میں

حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ فتح الباری میں لکھتے ہیں:

۱ - والمراد "بالكتاب" القرآن المتعبد بتلاوته، و"بالسنة" ما جاء عن النبي صلى الله عليه وسلم من أقواله وأفعاله وتقريره وما هَمَّ بفعله، والسنة في أهل اللغة الطريقة وفي اصطلاح الأصوليين والمحدثين ما تقدم. (کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، ج:۱۳،ص:۳۰۶)

''الکتاب'' سے مراد قرآن ہے جس کی تلاوت کو عبادت گذاری ٹھہرایا گیا ہے، اور ''السنۃ'' سے مراد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال، افعال، تقریر اور وہ چیزیں ہیں جن کے کرنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصد و ارادہ فرمایا، اور سنت اصل لغت میں طریقہ کے معنی میں ہے اور علمائے اصول اور علمائے حدیث کی اصطلاح میں یہی ہے جس کا اوپر بیان ہوا۔

حافظ عسقلانیؒ کی اس تصریح سے معلوم ہوا کہ حضرات محدثین اور اصولیین سنت کے اصطلاحی معنی میں متفق ہیں۔

٢- علامہ بدرالدین عینی متوفی ٨٥٥ھ نے بھی بعینہٖ انہی الفاظ میں سنت کی تعریف ذکر کی ہے (دیکھئے عمدۃ القاری، ج:٢٥،ص:٢٣ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ کی ابتدائی سطور)

٣- حافظ السخاوی متوفی ٩٠٢ھ نے اپنی نہایت مفید ومحققانہ تصنیف "فتح المغيث بشرح ألفية الحديث للعراقي" میں سنت کی تعریف یہ کی ہے "السنن المضافة للنبي صلى الله عليه وسلم قولاً له أو فعلاً أو تقريرًا، وكذا وصفًا وأيامًا" (ج:١،ص:١٣)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب قول، فعل، تقریر، نیز آپ کی صفات وایام سنت ہیں۔ حافظ سخاویؒ جنھوں نے سنت کی تعریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات اور آپ سے متعلق تاریخ وواقعات کو بھی شامل کیا ہے، الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ انھوں نے یہی تعریف حدیث کی بھی کی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ حدیث وسنت ان کے نزدیک ایک ہی ہیں۔

حدیث وسنت کو ایک معنی میں استعمال کی چند مثالیں

حافظ سخاویؒ اور علامہ فرنگی محلیؒ دونوں حضرات نے صراحت کی ہے کہ ائمہ حدیث کے کلام اور تصرفات سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث وسنت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، یعنی ان میں باہم نسبت تساوی کی ہے، تباین یا عام، خاص کی نسبت نہیں، ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

١- امام ابوداؤد سجستانی متوفی ٢٧٥ھ اہلِ مکہ کے نام اپنے مشہور رسالہ ومکتوب میں اپنی سنن کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فإن ذُكرلك عن النبي صلى الله عليه وسلم سُنّة ليس مما خرّجته فاعلم أنه حديث واهٍ" (رسالۃ الامام ابوداؤد السجستانی الی اہل مکۃ فی وصف سننہ مع تعلیق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ،ص:٣٤)

"اگر تم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کوئی سنت ذکر کی جائے، جس کی تخریج میں نے (اس کتاب میں) نہیں کی ہے تو جان لو کہ یہ حدیث ضعیف ہے"

امام ابوداؤد کی اس عبارت میں سنت وحدیث کا مرادف وہم معنی ہونا بالکل ظاہر ہے۔

٢- امام حافظ ابوبکر محمد بن موسیٰ حازمی متوفی ٥٨٤ھ ناسخ ومنسوخ کے موضوع پر اپنی نہایت مفید کتاب "الاعتبار في الناسخ والمنسوخ من الآثار" میں کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

فهذا كتاب أذكر فيها ما انتهيت إلى معرفته من ناسخ حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم ومنسوخه (خطبۃ الکتاب،ص:٣) اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ناسخ ومنسوخ حدیثوں کا ذکر کروں گا، جن کی معرفت تک میں پہنچ سکا ہوں، اسی خطبۂ کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

وإنما أوردنا نبذة منها ليعلم شدة اعتناء الصحابة بمعرفة الناسخ والمنسوخ في كتاب الله وسنة نبيه صلى الله عليه اذ شأنهما واحدة" (ص:٥)

میں نے یہ چند روایتیں پیش کی ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ قرآن وسنت میں ناسخ ومنسوخ کی معرفت کا صحابۂ کرام کو کس درجہ اہتمام تھا کیونکہ دونوں کی صفت (وجوب عمل میں) ایک ہے۔ پہلی عبارت میں حدیث ناسخ ومنسوخ کا اور دوسری عبارت میں ناسخ ومنسوخ سنت کا لفظ استعمال کیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ امام حازمی حدیث وسنت کو ایک معنی میں لیتے ہیں۔

٣- سنت کی لغوی تحقیق میں امام نوویؒ کی یہ عبارت تہذیب الأسماء والصفات کے حوالہ سے اوپر ذکر کی جاچکی ہے۔

وتطلق سنته صلى الله عليه وسلم على الأحاديث المروية عنه صلى الله عليه وسلم.

اور سنت رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا اطلاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

مروی احادیث پر ہوتا ہے۔ امام نوویؒ کی اس عبارت سے سنت وحدیث کا ایک ہونا بالکل ظاہر ہے۔

۴- شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانیؒ حدیث وخبر کے درمیان فرق کے قول کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ومن ثم قيل لمن يشتغل بالتواريخ وما شاكلها الأخباري، ولمن يشتغل بالسنة النبوية المحدث، وقيل بينهما عموم وخصوص مطلقاً فكل حديث خبر من غير عكس (نزہۃ النظر مع نور القمر، ص:۲۷)

اسی فرق کی بناء پر جو شخص تاریخ یا تاریخ جیسے امور میں اشتغال رکھتا ہے اسے اخباری (مورخ) کہا جاتا ہے اور جو سنت نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں مشغول رہتا ہے اسے محدث کہا جاتا ہے، اور کہا گیا ہے کہ خبر وحدیث میں عموم وخصوص کی نسبت ہے۔ لہٰذا ہر حدیث خبر ہے اور ہر خبر حدیث نہیں ہے۔ اس عبارت میں ایک جگہ سنت اور دوسری جگہ حدیث کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک دونوں ایک ہیں۔

بغرض اختصار صرف چار مثالوں پر اکتفاء کیا گیا ورنہ علمائے حدیث کے کلام سے دونوں کے مترادف ہونے کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

عام طور پر متأخرین محدثین حدیث وسنت کی اوپر مذکور یہی تعریف کرتے ہیں، اور اپنے کلام میں عام طور پر دونوں کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں جیسا کہ اوپر کی بیان کردہ تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے۔

ایک قدیم اصطلاح: علامہ محمد بن جعفر کتانی متوفی ۱۳۴۵ھ اپنی مشہور اور نہایت مفید تصنیف "الرسالة المستطرفة لبيان مشهور كتب السنة المشرفة" میں کتب سنن کے تعارف میں لکھتے ہیں:

"ومنها كتب تعرف بالسنن وهي في اصطلاحهم الكتب المرتبة على الأبواب الفقهية من الإيمان والطهارة والزكاة إلى آخرها وليس فيها شيء من

الموقوف لأن الموقوف لا يسمّى في اصطلاحهم سنة ويسمى حديثًا" (ص:۲۹)

اور ان کتب حدیث میں بعض وہ ہیں جو سنن سے معروف ہیں اور سنن ان کی اصطلاح میں ابواب فقہیہ پر مرتب کتابیں ہیں یعنی ایمان، طہارت، صلاۃ، زکوٰۃ الی آخرہ یعنی اسی ترتیب پر پوری کتاب مرتب ہوتی ہے۔ اور سنن کی کتابوں میں موقوف روایتیں نہیں ہیں؛ کیونکہ ان کی اصطلاح میں موقوف کو سنت نہیں کہا جاتا ہے، بلکہ حدیث کہا جاتا ہے۔

سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی ۸۱۶ھ نے بھی اس اصطلاح کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

السلف أطلقوا الحديث على أقوال الصحابة والتابعين لهم بإحسان وآثارهم وفتاواهم (خلاصہ، ص:۳۳ ملا علی کی شرح شرح نخبۃ الفکر کے صفحہ ۱۵۳ پر "خبر، حدیث اور اثر" کے بیان میں کتاب کے محقق نے خلاصہ کی یہ عبارت اپنی تعلیق میں نقل کی ہے)

ائمہ سلف نے "حدیث" کا اطلاق صحابہ اور تابعین کے اقوال، آثار اور ان کے فتاویٰ پر کیا ہے۔

غالباً اسی اصطلاح کے مطابق امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ نے امام سفیان ثوریؒ کی علوم میں جامعیت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

الناس على وجوه، فمنهم من هو إمام في السنة وإمام في الحديث، ومنهم من هو إمام في السنة وليس بإمام في الحديث، ومنهم من هو إمام في الحديث ليس بإمام في السنة، فأما من هو إمام في السنة وإمام في الحديث فسفيان الثوري (تقدمۃ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم، ص:۱۱۸)

علماء متعدد صفات کے حامل ہیں، ان میں بعض وہ ہیں جو سنت میں امام ہیں اور حدیث میں بھی امام ہیں، اور ان میں بعض وہ ہیں جو سنت میں امام ہیں اور حدیث میں امام نہیں ہیں، اور ان میں بعض وہ ہیں جو حدیث میں امام ہیں سنت میں امام نہیں ہیں تو

جوسنت اور حدیث دونوں میں امام ہیں وہ سفیان ثوریؒ ہیں۔ یعنی سفیان ثوریؒ احادیث مرفوعہ اور صحابہ وتابعین سے منقول آثار اور فتاویٰ سب میں امام وپیشوا تھے۔

متقدمین ائمہ حدیث کی سنت وحدیث کے بارے میں فرق کی یہ ایک اصطلاح تھی؛ لیکن متأخرین کے یہاں اس اصطلاح کا استعمال نہیں ہے۔ متقدمین ائمہ حدیث اگرچہ سنت وحدیث کے درمیان اصطلاحی طور پر یہ فرق کرتے ہیں؛ لیکن عام طور پر وہ شریعت میں صحابہ کے قول کو بھی حجت مانتے ہیں؛ اس لئے اس اصطلاحی فرق سے ان کی حجیت میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

ایک اور اصطلاح: بہت سے اصولیین اور بعض محدثین بھی سنت وحدیث میں اصطلاحی طور پر یہ فرق کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل، تقریر اور طریق صحابہ سب پر سنت کا لفظ بولتے ہیں، اور حدیث وخبر کا اطلاق صرف آپ ﷺ کے قول پر کرتے ہیں۔ مولانا عبدالحئ فرنگی محلی لکھتے ہیں:

ذكر ابن مَلَك في "شرح منار الأصول" أنّ سنة تطلق على قول رسول الله صلى الله عليه وسلم وفعله، وسكوته وطريقة الصحابة، والحديث والخبر مختصان بالأول.

سنت کا اطلاق رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل، سکوت، اور طریقۂ صحابہ پر کیا جاتا ہے اور حدیث وخبر پہلے (یعنی قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ خاص ہیں۔ (ظفر الامانی، ص:۲۴-۲۵)

محقق علاء الدین عبدالعزیز بخاری متوفی ۷۳۰ھ اصول بزدوی کی عبارت "- سكاً بالسنة والحديث" کے تحت لکھتے ہیں:

السنة أعم من الحديث لانها تتناول الفعل والقول، والحديث مختص بالقول" الخ (کشف الاسرار، ج:۱، ص:۵۹)

''سنت''، ''حدیث'' سے عام ہے کیونکہ سنت فعل وقول (سب کو) شامل ہے اور حدیث قول کے ساتھ خاص ہے۔ یہی تفصیل تلویح اور عضدی میں بھی ہے۔

لفظ سنت وحدیث کے درمیان استعمال کا یہ فرق بھی بس اصطلاح ہی کی حد تک ہے، جس سے ان کی حجیت قطعاً متاثر نہیں ہوگی؛ کیونکہ جو حضرات سنت کو عام معنی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کے معنی میں لیتے ہیں وہ تو اسے حجت مانتے ہی ہیں اور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو حدیث سے تعبیر کرتے ہیں اور سنت کا اطلاق اس پر نہیں کرتے ہیں وہ بھی اس حدیث قولی کو حجت قرار دیتے ہیں۔

سنت علمائے اصول کی اصطلاح میں

علمائے اصول جن کا موضوع احکام شرعی کے اصول ومآخذ کا بیان، اور کتاب وسنت کے نصوص سے اخذ معانی وغیرہ کے قواعد وضوابط کی تنقیح وتدوین ہے، جب وہ اپنے موضوع کے مطابق فقہی احکام کے دوسرے مصدر ومآخذ کی حیثیت سے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہیں تو اپنے فن کے تحت سنت کی تعریف بھی بیان کرتے ہیں بطور نمونہ اصول فقہ کی مستند ومعروف چند کتابوں سے یہ تعریف نقل کی جارہی ہے۔

۱- قاضی بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ "منهاج الوصول إلى علم الأصول" میں لکھتے ہیں:

الكتاب الثاني في السنة: وهو قول الرسول صلى الله عليه وسلم او فعله الخ.

کتاب ثانی سنت کے بیان میں اور سنت رسول اللہ ﷺ کا قول یا فعل ہے۔

شیخ جمال الدین اسنوی متوفی ۷۷۲ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

أقول: السنة لغة هي العادة والطريقة قال الله تعالى: "قد خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا في الأرضِ" اى طرق، وفي الاصطلاح تطلق على ما يقابل الفرض من العبادات، وعلى ما صدر من النبي صلى الله عليه وسلم من الأفعال أو الأقوال ليست للإعجاز وهذا هو المراد ههنا، ولما كان التقرير عبارة من الكف عن الإنكار والكف فعل كما تقدم استغنى المصنف عنه به

أی عن التقریر بالفعل" (نهاية السول في شرح منهاج الوصول إلى علم الأصول على الهامش التقرير والحبير، ج:۲، ص:۵۲)

میں کہتا ہوں کہ سنت لغت میں عادت اور طریقہ کے معنی میں ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قد خلت الخ یعنی تحقیق کہ تم سے پہلے طریقے گذر چکے ہیں، لہٰذا زمین میں گھوم پھر (کر انہیں دیکھ لو) (آیت میں مذکور لفظ سُنَن بمعنی) طریقے ہے، اور اصطلاح میں (۱) ان عبادتوں پر سنت کا اطلاق ہوتا ہے جو فرض کے مقابل ہیں، (۲) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ان افعال واقوال پر ہوتا ہے جو (صراحتاً) قرآن میں نہیں ہیں، اور اس جگہ یہی دوسرا اصطلاحی معنی مراد ہے، اور جب انکار سے رکنے کو تقریر سے تعبیر کیا جاتا ہے تو ''کف'' یعنی رکنا (ایک) فعل ہے اس لئے قول کے ساتھ فعل کے ذکر کے بعد تقریر کے ذکر کی مصنف نے ضرورت نہیں سمجھی۔

۲-امام ابواسحاق الشاطبی متوفی ۷۹۰ھ لکھتے ہیں:

ويطلق لفظ السنة على ما جاء منقولا عن النبي صلى الله عليه وسلم على الخصوص بما لم ينص عليه في الكتاب العزيز بل إنما نص عليه من جهته عليه الصلوٰة والسلام كان بياناً لما في الكتاب؛ أولاً، ويطلق أيضاً في مقابلة البدعة، فيقال: "فلان على سنة إذا عمل على وفق ما عمل عليه النبي صلى الله عليه وسلم، كان ذلك مما نص عليه في الكتاب أولاً، ويقال: فلان على بدعة "إذا عمل على خلاف ذلك، وكأن هذا الإطلاق إنما اعتبر فيه عمل صاحب الشريعة فأطلق عليه لفظ السنة من تلك الجهة، وإن كان العمل بمقتضى الكتاب.

ويطلق أيضا لفظ السنة على ما عمل عليه الصحابة وجد ذلك في الكتاب أو السنة أو لم يوجد لكونه اتباعاً لسنة ثبتت عندهم لم تنقل إلينا، أو اجتهادًا مجتمعاً عليه منهم أو من خلفائهم... وإذا جمع ما تقدم تحصل منه في الإطلاق أربعة أوجه، قوله عليه الصلاة والسلام، وفعله، وإقراره-

وكل ذلك إما متلقى بالوحي أو بالاجتهاد، وهذه ثلاثة، والرابع ما جاء عن الصحابة أو الخلفاء. (الموافقات، ج:٤، ص:٣ تا ٦)

اور لفظ سنت ان امور پر بولا جاتا ہے جو نبی ﷺ سے منقول ہوکر آئے ہیں بالخصوص وہ امور جو قرآن مجید میں منصوص نہیں ہیں؛ بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی جانب سے مذکور ہیں، پھر وہ امور قرآن کی مراد کا بیان وتفسیر ہوں، یا ایسے نہ ہوں۔

اور سنت کا لفظ بدعت کے مقابلہ میں بھی بولا جاتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے فلاں سنت پر ہے؛ جبکہ اس کا عمل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے موافق ہو، خواہ یہ عمل ان اعمال میں سے ہو جن کی قرآن میں صراحت کی گئی ہے، یا ایسا نہ ہو، اور کہا جاتا ہے فلاں بدعت پر ہے؛ جبکہ اس کا وہ عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے موافق نہ ہو، گویا اس اطلاق میں صاحب شریعت (ﷺ) کے عمل کا اعتبار کیا گیا ہے، اور اسی لحاظ سے اس پر سنت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اگرچہ وہ عمل بتقاضائے کتاب الٰہی ہو۔

نیز لفظ سنت کا اطلاق صحابہ کرامؓ کے عمل پر بھی ہوتا ہے قرآن وحدیث میں اس کے وجود سے ہم واقف ہوں یا نہ ہوں؛ کیونکہ صحابہؓ کا یہ عمل یا تو سنت کی اتباع میں ہوگا جو ان کے نزدیک ثابت تھی اور ہم تک نہیں پہنچی یا ان کے اجماعی اجتہاد یا خلفاء کے اجتہاد کی بناء پر ہوگا... ان مذکورہ صورتوں کو جمع کیا جائے تو سنت کے اطلاق کی چار صورتیں نکلیں گی: (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول، (۲) آپ کا فعل، (۳) آپ کا اقرار واثبات اور یہ سب یا تو وحی سے حاصل شدہ ہوں گی یا اجتہاد سے یہ تین قسمیں ہوئیں، (۴) اور چوتھی قسم صحابہؓ یا خلفاءؓ سے ثابت شدہ امور ہیں۔

محقق ابن ہمام متوفی ۸۶۱ھ نے اصول فقہ میں اپنی مشہور وکثیر الفائدہ تصنیف ''التحریر'' میں سنت کی تعریف یہ کی ہے: "وفي الاصول قوله عليه السلام وفعله و تقريره وفي فقه الحنفية: ما واظب على فعله مع ترك بلا عذر ليلزم كونه بلا وجوب، وما لم يواظبه مندوب ومستحب" (التقریر والتحبیر شرح التحریر، ج:۲، ص:۲۲۳)

سنت اصول فقہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل اور تقریر کو کہتے

ہیں، اور فقہ حنفی میں جس فعل پر آپ نے مواظبت فرمائی ہے بغیر عذر کے کبھی کبھار ترک کے ساتھ (ترک بلا عذر کی قید اس لئے ہے) تاکہ لازم ہو جائے کہ اس فعل پر ہمیشگی بطور وجوب کے نہیں تھی (کیونکہ بلا عذر ترکِ فعل کی واجب میں رخصت واجازت نہیں)

اس تعریف کا صاف مطلب یہ ہے کہ فقہائے اصول جب فقہ کے ادلۂ اربعہ کے ضمن میں سنت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی تعریف آنحضرت ﷺ کے قول وفعل سے کرتے ہیں تو یہی سنت ان کے نزدیک مسائل کے لئے دلیل وحجت ہوتی ہے اور عبادات کے مراتب کی تعیین کے وقت بالخصوص فقہائے احناف فرض وواجب کے بعد اور نفل سے پہلے جب لفظ سنت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی تعریف ما واظب علی فعله الخ یا الطريقة المسلوكه في الدين سے کرتے ہیں تو اس سنت کا ان کے نزدیک احکام شرعی کی حجت ودلیل ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے؛ بلکہ یہ تو اس حکم شرعی کا عرفی نام ہے جو آنحضرت ﷺ کے عمل مع المواظبة بترك ما سے ثابت ہوا ہے۔

سنت کی اصولی وفقہی یہی تعریفیں قدیم وجدید سب مصنّفین اپنی اصول فقہ کی کتابوں میں بیان کرتے ہیں، ان سب کے ذکر میں تکرار محض اور طوالت ہے؛ اس لئے بطور نمونہ تین ماہر فن علماء کی تحریروں پر اکتفا کیا جارہا ہے، جن میں پہلے شافعی دوسرے مالکی اور تیسرے حنفی ہیں۔

اب تک کی بحث کا خلاصہ

۱- سنت کا اصل لغوی معنی طریقہ ہے۔

۲- حدیث کا لغوی معنی، غیر موجود کا وجود میں آجانا، خبر، کلام خواہ کم ہو یا زیادہ۔

۳- سنت محدثین کی اصطلاح میں: نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال، افعال، تقریرات، احوال وصفات، حتی کہ بیداری وخواب کی حالت میں آپ کا سکون وحرکت۔

جمہور محدثین کے نزدیک سنت وحدیث ہم معنی ہیں؛ لہٰذا دونوں کی ایک ہی

تعریف ہے۔

۴- متقدمین ائمہ حدیث کی اصطلاح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر سنت ہیں اور صحابہ وتابعین کے آثار واقوال حدیث ہیں۔ متأخرین نے اس اصطلاح کی جگہ صحابہ کے آثار کے لئے موقوف کی، اور تابعین کے اقوال کے لئے مقطوع کی اصطلاح وضع کی اور اب یہی رائج ہے۔

۵- سنت اصولیین کی اصطلاح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر کو کہتے ہیں، نیز ایک جماعت نے صحابہ کے آثار کو بھی سنت میں داخل کیا ہے۔

۶- سنت فقہائے احناف کی اصطلاح میں: الطريق المسلوك في الدين (یعنی من غير افتراض ولا وجوب، اور بالفاظ دیگر ما واظب على فعله مع ترك ما بلا عذر. تعریف کے پہلے الفاظ امام بزدویؒ کے ہیں، اور دوسرے الفاظ محقق ابن ہمام نے "التحرير" میں ذکر کئے ہیں، یہ صرف تعبیر کا تنوع ہے، ورنہ دونوں کا حاصل ایک ہی ہے؛ کیونکہ "الطريقة المسلوكة في الدين" ما واظب عليه کے ہم معنی ہے۔ قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ لکھتے ہیں:

ومعنى بالطريقة المسلوكة ما واظب عليه النبى صلى الله عليه وسلم ولم يترك الا نادرًا الخ (کشاف اصطلاحات الفنون، ج:۱ص:۷۰)

۷- ایک اور استعمال: ''سنت'' کا اطلاق کبھی بدعت کے مقابلہ میں ہوتا ہے (جیسا کہ امام شاطبی کی عبارت سے معلوم ہو چکا ہے۔ اس اطلاق میں لفظ سنت حدیث پاک "من أحدث في أمرنا هذا ليس منه فهو ردّ" میں واقع ''امرنا'' کے ہم معنی ہے۔ یعنی دین کی وہ تمام باتیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب رسولؐ سے ثابت ہیں، لفظ سنت ان سب کو شامل ہوگا، خواہ وہ امور اور باتیں قرآن سے ماخوذ ہوں یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے، چاہے ان کا تعلق اعتقاد سے ہو یا عمل سے۔ اس اطلاق میں لفظ سنت ان سب کو حاوی ہوگا اور اس وقت اس کا تعلق احکام پر حجت ہونے یا عبادت مسنونہ کے عرفی نام سے بالکل نہیں ہوگا۔

چنانچہ علامہ عبدالغنی نابلسی "الحديقة الندية شرح الطريقة المحمدية" میں حدیث پاک "فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين" (الحديث) کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

أي الزموا، يقال: عليك زيدًا أي الزمه، وسنّته، اسم لأقواله، وأفعاله، واعتقاداته، وأخلاقه، وسكوته عند قول الغير أو فعله، والخلفاء، جمع خليفة والمراد من الخلفاء: الأربعة أبوبكر وعمر، وعثمان، وعلى رضى الله عنهم، الخ (تحفة الأخيار بإحياء سنة سيد الأبرار ازمولانا عبدالحئ فرنگی محلی مع تعلیق علامہ عبدالفتاح ابوغدہ، ص:۵۱)

لہٰذا احادیث وغیرہ میں وارد لفظ ''سنت'' کو جو اپنے معنی میں پوری شریعت کو حاوی ہے، فقہاء کی مصطلحہ سنت پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی حدیث پاک "الفطرة خمس – أو خمس من الفطرة – الختان والاستحداد" الحديث. کی شرح میں ختنہ کے احکام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام شافعی اور جمہور شوافع مرد وعورت دونوں کے حق میں ختنہ کے وجوب کے قائل ہیں، اور اکثر علماء اور بعض شوافع کے نزدیک واجب نہیں؛ بلکہ سنت ہے، اور ان حضرات نے اپنے اس مسلک پر حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کی اس مرفوع حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "الختان سنة للرجال، مكرمة للنساء" وهذا لا حجة فيه لما تقرران السنة إذا ورد في الحديث لا يراد به التي تقابل الواجب" (فتح الباری شرح صحیح البخاری باب قص الشارب، ج:۱۰، ص:۴۱۸)

یعنی ختنہ مردوں کے لئے سنت اور عورتوں کے لئے فضیلت ہے ''لیکن حدیث میں وارد لفظ ''سنت'' کو ختنہ کے مسنون ہونے پر حجت نہیں قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ ثابت اور طے شدہ بات ہے کہ لفظ ''سنت'' جب حدیث میں آتا ہے تو اس سے وہ سنت مصطلحہ جو فرض کے مقابل ہے مراد نہیں ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں اسی حدیث کے تحت کچھ پہلے لکھتے ہیں "والتعبير في بعض

روايات الحديث "بالسنة" بدل الفطرة يراد بها الطريقة لا التي تقابل الواجب، وقد جزم بذلك الشيخ أبو حامد والماوردي وغيرهما وقالوا: هو كالحديث الآخر "عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين" (ص:۴۱۷)

اس حدیث کی بعض روایتوں میں لفظ ''فطرة'' کی بجائے عشر من السنة کی عبارت ہے۔ اس میں بھی سنت سے مراد طریقہ ہی ہے وہ سنت نہیں جو واجب کے مقابل ہے، شیخ ابوحامد (یعنی امام غزالی) اور امام (ابوالحسن علی) ماوردی وغیرہ علماء نے تحقیق کے ساتھ یہ بات کہی ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں اس حدیث میں وارد لفظ ''سنت'' طریقہ کے معنی میں ہے، جس طرح دوسری حدیث "عليكم بسنتي وسنة الخلفاء" میں یہی معنی مراد ہے۔

پھر یہ بات تو مقرر و متعین ہے کہ علوم حدیث وفقہ کی اصطلاحات عہد تابعین کے تقریباً اختتام کے بعد یعنی دوسری صدی ہجری اور اس کے بعد کے زمانہ میں وضع کی گئی ہیں، تو حدیث میں وارد لفظ ''سنت'' کو ایسے معنی پر کیونکر محمول کیا جاسکتا ہے جس کا اس لفظ کے ورود کے وقت وجود ہی نہیں تھا۔

لہٰذا حدیث وفقہ کے مطالعہ کے وقت شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مستعمل لفظ ''سنت'' نیز محدثین، اصولیین اور فقہاء کی اصطلاحی سنتوں کے باہمی فرق اور ان کے مواقع استعمال کی رعایت از بس ضروری ہے؛ تاکہ فہم نصوص میں غلط فہمی دراندازنہ ہونے پائے۔

آمدم برسر مطلب:

یہ دراز نفسی اور طول کلامی محض اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ مسئلہ زیر بحث پر مکمل بصیرت کے ساتھ بحث ونظر کے لئے ضروری ہے کہ پہلے حدیث وسنت کے لغوی واصطلاحی معانی ذہن نشین کر لئے جائیں، پھر بطور خاص لفظ ''سنت'' کی اصطلاحات واطلاقات میں جو تنوع ہے اس کا بھی خانۂ ذہن وفکر میں موجود رہنا لازمی ہے، ورنہ

ایک اصطلاح دوسری اصطلاح کے ساتھ گڈمڈ ہوسکتی ہے اور اس صورت میں لفظ سنت کے صحیح معانی ومرادات تک نہیں پہنچا جاسکتا ہے۔ کسی حکیم شاعر نے کس قدر مبنی بر حقیقت بات کہی ہے:

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

اسی کجی سے اپنے آپ اور اپنے قارئین کو محفوظ رکھنے کے لئے یہ ناگزیر طوالت برداشت کی گئی، پھر اطناب مفید کو تو اہل زبان کی جانب سے سند حسن قبول بھی حاصل ہے؛ اس لئے یہی توقع ہے کہ باذوق اصحابِ علم وفہم پر یہ تفصیلات بار خاطر نہیں ہوں گی۔

آئندہ سطور میں فاضل محترم کے اس جدید نقطۂ نظر پر کہ ''سنت حجت ہے حدیث نہیں'' ایک طالب علمانہ جائزہ پیش کیا جارہا ہے:

(ا) فاضل محترم فرماتے ہیں: حدیث وسنت میں کیا فرق ہے؟ یہ فرق لوگ نہیں جانتے، بلکہ لوگوں میں غلط فہمی ہے۔ یا غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے کہ حدیث سنت ایک ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے... پھر دونوں کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''حدیث اور سنت دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا تو نہیں ہیں... مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ دونوں میں تساوی کی نسبت ہو، بلکہ حدیث اور سنت میں عموم وخصوص من وجہ کی نسبت ہے''

(ج) جمہور محدثین حدیث وسنت کو باہم مرادف مانتے ہیں اسی لئے ایک کی جگہ دوسرے کا بے تکلف استعمال کرتے ہیں، مولانا عبدالحئ فرنگی محلی لکھتے ہیں: "وكثيرًا ما يقع في كلام الحفاظ ما يدل على الترادف" حدیث وسنت کی اصطلاحی تعریف کے ضمن میں امام نوویؒ، حافظ سخاویؒ وغیرہ علماء فن حدیث کے حوالہ سے حضرات محدثین کے مسلک کو متفق طور پر نقل کیا جاچکا ہے، اسے ملاحظہ کرلیا جائے، نیز اس بارے میں مزید اطمینان کے لئے حافظ خطیب بغدادیؒ کی ''الکفایہ'' امام حاکم کی ''علوم الحدیث''،

حافظ سیوطی کی ''تدریب الراوی'' وغیرہ کتب اصول حدیث کے مقدمات واوائل کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

لہٰذا جو لوگ حدیث وسنت کو ایک سمجھتے یا ایک بتاتے ہیں، وہ نہ تو غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور نہ ہی غلط فہمی پیدا کرتے ہیں؛ بلکہ ائمہ فن اور حفاظِ حدیث کے صحیح ومحقق مسلک کی ترجمانی کرتے ہیں۔

البتہ محدثین کی مذکورہ حدیث وسنت اور علماء اصولیین کی معرَّفہ سنت میں بھی ترادف ہے یا نہیں، تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ جن محدثین نے حدیث کی تعریف میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صرف قول وفعل وتقریر کا ذکر کیا ہے، تو ان کی تعریف کے لحاظ سے محدثین واصولیین کی مذکورہ حدیث وسنت مرادف ہونگی (کما ذکرہ الحافظ العسقلانی فی فتح الباری، ج:۱۳، ص:۳۱۶ کما مرّ)

اور جن محدثین نے حدیث کی تعریف میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے احوال وصفات غیر اختیاریہ کو بھی شامل کیا ہے، ان کی تعریف کی رو سے حدیث اہل اصول کی سنت سے عام ہوگی۔

اور جن علماء حدیث واصول نے لفظ حدیث کا اطلاق خاص قول رسول ﷺ پر کیا ہے اور لفظ ''سنت'' کو قول وفعل وغیرہ کے ساتھ عام رکھا ہے ان کی اصطلاح کے تحت سنت، حدیث سے عام ہوجائے گی۔

محدثین واصولیین کے درمیان یہ اختلاف صرف ان احادیث ہی میں ہوگا جو آنحضرت ﷺ کے غیر اختیاری احوال واوصاف وغیرہ پر مشتمل ہیں، رہے رسول خدا ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات تو ان امور سے متعلق احادیث میں دونوں طبقہ کے علماء میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ بحث ملحوظات میں گذر چکی ہے (مزید فائدہ کے لئے ظفر الامانی، ص:۲۴ اور توجیہ النظر، ج:۱، ص:۳۷ و۴۰ دیکھئے)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ فاضل موصوف نے عام ائمہ فن اور حفاظ حدیث کے مسلک راجح کی بجائے مرجوح قول کو اختیار کیا ہے، اس اختیار وپسندیدگی کی کوئی وجہ اور

دلیل ذکر نہیں کی ہے، لہٰذا اس بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے ''پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا''

(۲) فاضل محترم نے اپنی اختیار کردہ رائے کے تحت حدیث وسنت کی الگ الگ تعریفات وتفصیلات بیان کی ہیں، چنانچہ حدیث سے متعلق بعض امور کا ذکر کرنے کے بعد سنت سے متعلق درج ذیل معلومات فراہم کی ہیں:

''سنۃ'' کے لغوی معنی ہیں راستہ (الطریق) اور یہ لفظ قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے، احادیث میں بھی آیا ہے، اور فقہ میں بھی، اور تینوں جگہ میں معنی الگ الگ ہیں۔ قرآن میں ہے "وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلاً" تم اللہ کی سنت کو بدلتا ہوا نہیں پاؤ گے۔ اور حدیث میں ہے "ترکتُ فیکم أمرین" میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں: "لن تضلّوا ما تمسّکتم بهما" جب تک تم ان دونوں کو مضبوط پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہیں ہوؤ گے، وہ دو چیزیں کیا ہیں "کتاب اللّٰه و سنّتي" اللہ کی کتاب اور میرا طریقہ۔ اور فقہ میں سنت مؤکدہ اور سنت غیر مؤکدہ کی اصطلاحیں ہیں۔ غرض تینوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور تینوں جگہ معنی الگ الگ ہیں۔

فقہ میں سنت: احکام کا ایک درجہ ہے، واجب سے نیچے اور مندوب سے اوپر...

قرآن مجید میں وارد لفظ سنت کے معنی کی وضاحت کے بعد حدیث میں آئے لفظ سنت کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اور حدیث میں سنت کے معنی ہیں: "الطریقة المسلوکة في الدین" یعنی دینی راہ، وہ راستہ جس پر مسلمانوں کو چلنا ہے'' قرآن کریم میں ہے "قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِي اَدْعُوا اِلَى اللّٰهِ" کہئے یہ میرا راستہ ہے، میں لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میرا راستہ یعنی حضور ﷺ کا راستہ، اسی کے لئے حدیثوں میں لفظ سنت آیا ہے''... پھر موضوع سے بظاہر گریز کرتے ہوئے ''مسئلہ نسخ'' پر ہلکی سی روشنی ڈالی ہے کہ نسخ شریعتوں میں ہوتا ہے دین میں نہیں... قرآن کریم میں کوئی ایسی آیت نہیں جو اپنے تمام مواد میں منسوخ ہو،... لیکن حدیث کی ایسی صورت نہیں ہے، پہلے دور کے جو احکام تھے، وہ بھی حدیث کی

کتابوں میں موجود ہیں اور بعد میں جو احکام آئے وہ بھی حدیث کی کتابوں میں ہیں، پس پہلی قسم کی روایتیں صرف حدیث ہیں سنت نہیں ہیں اور دوسری قسم کی روایتیں حدیث بھی ہیں اور سنت بھی'' (بلفظہ مع اختصار)

(ج) فاضل محترم کی عبارت کے اس طویل اقتباس میں کئی امور غور طلب اور محتاج بحث ونظر ہیں:

(۱) لفظ ''سنت'' کے صرف ان تین محل استعمال قرآن، احادیث، فقہ کے ہی ذکر پر کیوں اکتفا کیا گیا؛ جبکہ مسائل کی حجیت میں ان کا دخل بھی نہیں ہے، اور اصول فقہ میں مذکور لفظ سنت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا، حالانکہ اسے احکام فقہ کے ادلہ اربعہ میں دوسری دلیل وحجت کا درجہ حاصل ہے اور اسی سنت سے موصوف کے موضوع کا راست تعلق بھی ہے، پھر اس کا معنی بھی تینوں مواقع میں مذکورہ لفظ سنت سے الگ ہے، ان اہم وجوہِ ذکر کے باوجود آخر اس سے نگاہ پھیر لینے کی کیا وجہ ہے؟ کیا یہ بھول چوک کی کارستانی ہے، یا خلاف مقصد جان کر اس کو چھوڑ دیا گیا ہے؟ (والعلم عنداللہ)

(۲) مواقع مذکورہ میں وارد تینوں لفظ سنت میں سے قرآن وحدیث میں مستعمل سنت کے معنی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، مگر فقہ میں مذکور سنت کا صرف درجہ بیان کیا گیا ہے اصطلاحی تعریف کے ذریعہ اسے معلوم ومشخص کرنے پر توجہ نہیں دی گئی جبکہ تعریف وتعیین سے پہلے شئی مجہول کو کسی خاص مقام ومرتبہ پر کیسے رکھا جا سکتا ہے۔ (تدبر)

آخر میں حدیث میں مستعمل لفظ سنت کا معنی درج ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

اور حدیث میں سنت کے معنی ہیں "الطریقة المسلوکة في الدین" یعنی دینی راہ، وہ راستہ جس پر مسلمانوں کو چلنا ہے،... یعنی حضور ﷺ کا راستہ، اسی (معنی) کے لئے حدیثوں میں لفظ سنت آتا ہے'' (بلفظہ)۔

(۳) ملحوظات کے ضمن میں اکابر علماء حدیث واصول کی تحقیقات سے مستفاد یہ بات گذر چکی ہے کہ احادیث میں وارد لفظ ''سنّتی'' سنت رسول سے مراد "الطریقة المشروعة والمتبعة في الدین" ہے یعنی وہ مشروع طریقہ جس کی دین میں اتباع

اور پیروی کی جاتی ہے، بالفاظ دیگر سنت رسول کا معنی منہج نبوی، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی طرز زندگی ہے جس میں آپ ﷺ کے اقوال وافعال اور تقریرات سے ثابت اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق وغیرہ خواہ یہ فرض ہوں یا واجب وسنت اور مستحب ومندوب وغیرہ مجموعۂ شریعت شامل ہے۔

غالباً ہمارے فاضل محترم نے اسی معنی کو اپنے مختصر الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے ''دینی راہ، وہ راستہ جس پر مسلمانوں کو چلنا ہے، اسی کے لئے حدیثوں میں یہ لفظ آتا ہے'' (واللہ اعلم بالصواب)

ظاہر ہے کہ لفظ ''سنت'' اپنے اس معنی کے اعتبار سے احکام کے لئے دلیل وحجت نہیں بن سکتا ہے؛ کیونکہ شرعی احکام بلکہ مکمل شریعت اپنے وجود وثبوت میں بجائے خود اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال سے استدلال کی محتاج ہے، جب تک ان پر رسولِ خدا ﷺ کے قول وفعل کی (صراحتاً واستنباطاً) مہر ثبت نہ ہو جائے اس وقت تک یہ شرعی احکام کہے جانے ہی کے مستحق نہیں ہوتے تو پھر یہ کسی شرعی حکم کے لئے دلیل وحجت کیسے بن سکتے ہیں۔ علمائے امت کے مذہب کے مطابق صرف اور صرف وہی لفظ سنت فقہی مسائل میں حجت ہوگا جس کی اصطلاحی تعریف رسول اللہ ﷺ سے صادر اقوال وافعال سے کی جاتی ہے۔ اس کے ماسوا وہ لفظ سنت جو دیگر اصطلاحات واطلاقات سے وابستہ ہے، اپنی تمام تر افادیت واہمیت کے باوصف بابِ استدلال واحتجاج میں بالکل مؤثر نہیں ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

''لیکن حدیث کی ایسی صورت نہیں ہے، پہلے دور کے جو احکام تھے وہ بھی حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں اور بعد میں جو احکام آئے وہ بھی حدیث کی کتابوں میں ہیں، پس پہلی قسم کی روایتیں صرف حدیث ہیں، سنت نہیں، اور دوسری قسم کی روایتیں حدیث بھی ہیں اور سنت بھی'' (بلفظہ)

(۴) جائزہ کے صفحہ ۱۳ پر امام حافظ ابوبکر حازمی متوفی ۵۸۴ھ کی مشہور اور اپنے

موضوع پر محقق کتاب الاعتبار في الناسخ والمنسوخ من الآثار'' سے یہ دو عبارتیں نقل کی جا چکی ہیں۔

(۱) "هذا الكتاب أذكر فيها ما انتهيت إلى معرفته من ناسخ حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم ومنسوخه" (۲) "وإنما أوردنا نبذة منها ليعلم شدة اعتناء الصحابة بمعرفة الناسخ والمنسوخ في كتاب الله وسنة نبيّه صلى الله عليه وسلم"

امام حازمی کی یہ عبارت اس بات میں نص ہے کہ حدیث کی طرح سنت بھی ناسخ ومنسوخ ہوتی ہے، جبکہ ہمارے فاضل محترم کا بیان یہ ہے کہ منسوخ صرف حدیث ہے، منسوخیت کی صفت سے حدیث کے یہ اختصاص کی بات اگر خود آں محترم کے فکر ونظر کی پیداوار ہے تو یہ ائمہ حدیث کے قول کے خلاف ہے، لہٰذا یہ رائے اعتبار کے کس درجہ میں ہوگی وہ ظاہر ہے، اور اگر ان کے اس قول کی پشت پر ائمہ حدیث واصول کی سند ہے تو اسے نقل کرنا چاہئے، کیونکہ ہم فنون کی وضع وتدوین کے مقام میں نہیں بلکہ مقام اخذ ونقل میں ہیں؛ اس لئے علمی حلقوں میں ہماری وہی بات پایۂ اعتبار حاصل کر سکے گی جسے ائمہ فن کی تائید وتصدیق میسر ہو، علامہ ابن تیمیہؒ نے اسی اصول کو ''مقدمہ اصول تفسیر'' میں اپنے اس مختصر مگر نہایت بلیغ جملہ "العلم إما قول مصدَّق، وإما استدلال محقَّق" میں بڑے ہی لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے، لہٰذا ہمیں ائمہ کی تصدیق کی اہمیت کو محسوس کرنا چاہئے۔

(۳) آگے مادۂ افتراقی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تین قسم کی روایتیں صرف حدیث ہیں سنت نہیں ہیں، ایک وہ حدیثیں جو منسوخ ہیں وہ سنت نہیں ہیں... دوسری قسم: وہ حدیثیں ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہیں وہ اگرچہ حدیثیں ہیں مگر سنت نہیں ہیں... تیسری قسم: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مصلحت سے کوئی بات فرمائی یا کوئی عمل کیا تو وہ حدیث ہے مگر سنت نہیں، اس کی پانچ مثالیں سنیں اور اتنی مثالیں اسلئے پیش کر رہا ہوں کہ یہ مسائل سمجھنے ضروری ہیں۔

مغرب سے پہلے نفلیں پڑھنا سنت نہیں ہے پہلی مثال،...کھڑے ہوکر پیشاب کرنا سنت نہیں، دوسری مثال...حیض کے زمانہ میں بیوی کو ساتھ لٹانا سنت نہیں، تیسری مثال...زور سے آمین کہنا حنفیہ کے نزدیک سنت نہیں پانچویں مثال'' (بلفظہ مع اختصار)۔

(ج) فاضل محترم کے بیان کے مطابق تین قسم کی روایتیں صرف حدیث ہیں سنت نہیں ہیں، ایک وہ حدیثیں جو منسوخ ہیں، وہ سنت نہیں ہیں۔

(۱) جائزہ ۲ جز ۴ میں اس تخصیص سے متعلق کلام گذر چکا ہے جس کے اعادہ کی ضرورت نہیں، البتہ وہ حدیثیں جو پہلے دور میں معمول بہا تھیں بعد میں منسوخ ہوگئیں، وہ اپنے پہلے دور میں سنت تھیں یا نہیں اگرچہ موصوف نے صراحتاً اس کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا ہے لیکن انھوں نے حدیث وسنت کے درمیان جو فرق بیان کیا ہے اس سے تو یہی مفہوم ہورہا ہے کہ وہ منسوخ ہونے سے پہلے سنت تھیں منسوخ ہوجانے کے بعد حدیث ہوگئیں، اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ سنت میں بھی نسخ ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

(۲) موصوف نے حدیث منسوخ کی مثال میں "توضّوا مما مسّت النار" کو پیش کیا ہے، اور آخر میں بطور نتیجہ فرمایا ہے'' حدیث "توضّوا مما مست النار" سنت نہیں ہے۔

بلاشبہ جمہور امت کے نزدیک یہ حدیث منسوخ ہے، لیکن امت کا ایک طبقہ اسے منسوخ نہیں سمجھتا ہے اور آگ کی آنچ زدہ چیزوں کے استعمال سے وضو کا قائل ہے۔ امام حازمی نے سلف صالحین میں سے درج ذیل حضرات کے ناموں کی صراحت کی ہے جو اس مذہب پر کاربند ہیں عبداللہ بن عمر، ابوطلحہ، انس بن مالک، ابوموسیٰ، عائشہ، زید بن ثابت، ابوہریرہ، ابوعزہ الہذلی، عمر بن عبدالعزیز، ابومجلز، لاحق بن حمید، ابوقلابہ، یحییٰ بن یعمر، حسن بصری، زہری (رضی اللہ عنہم) (الاعتبار، ص:۳۹)

لہٰذا ان بزرگوں کے مذہب کے اعتبار سے، فاضل محترم کے بیان کے مطابق اسے حدیث کی بجائے سنت میں شمار کیا جائیگا۔

(۳) آگے فرماتے ہیں:

دوسری قسم: وہ حدیثیں ہیں جو نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہیں وہ اگرچہ حدیثیں ہیں مگر سنت نہیں، (بلفظہ)

اس بارے میں عرض ہے کہ جائزہ کے صفحہ ۱۶ پر ایک اور اصطلاح کے زیر عنوان ابن مَلک کی شرح منار الاصول، کشف الاسرار شرح اصول بزدوی، اور تلویح، وعضدی کے حوالہ سے یہ بات گذر چکی ہے کہ علمائے اصول کی ایک بڑی جماعت حدیث کا اطلاق صرف آنحضرت ﷺ کے قول پر کرتی ہے اور سنت کا اطلاق آپ کے قول وفعل- سب پر کرتی ہے، ان کی اس اصطلاح کے مطابق نبی کریم ﷺ کی خصوصیات سے متعلق ساری روایتیں سنت ہی ہوں گی؛ کیونکہ جو امور آپ کے ساتھ خاص ہیں، ان کا تعلق فعل ہی سے ہے قول سے نہیں ہے، جبکہ اس کے برعکس موصوف فرماتے ہیں کہ ''وہ حدیثیں جو نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہیں وہ اگرچہ حدیثیں ہیں مگر سنت نہیں'' اب کس کی بات مانی جائے فیصلہ آپ خود کرلیں۔

(۴) تیسری قسم کے بارے میں فاضل محترم نے اپنی تحقیق ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مصلحت سے کوئی بات فرمائی یا کوئی عمل کیا تو وہ حدیث ہے مگر سنت نہیں'' پھر موصوف نے اس کی پانچ مثالیں ذکر کی ہیں۔

(ج) پتہ نہیں یہ کونسی خاص مصلحت ہے کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام جس کی رعایت کبھی کبھی فرماتے ہیں کہ جس قول وعمل میں یہ مصلحت ملحوظ ہوتی ہے وہ قول وعمل سنت کی بجائے حدیث ہوجاتا ہے جبکہ علماء کے نزدیک یہ مسلمات میں سے ہے کہ شرائع واحکام کی وضع ہی بندوں کے مصالح دینی ودنیوی کے لئے ہوئی ہے، چنانچہ امام شاطبیؒ کتاب مقاصد الشرع کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"ولنقدم قبل الشروع في المطلوب مقدمة كلامية مسلمة في هذا الموضع، وهي أن وضع الشرائع إنما هو لمصالح العباد في العاجل والآجل

معًا الخ" (الموافقات، ج:۲،ص:٦)

اس مقام پر ہم اصل مقصد کو شروع کرنے سے پہلے علم کلام کا ایک مسلمہ مقدمہ پیش کررہے ہیں وہ یہ ہے کہ شرائع کی وضع ہی بندوں کے دین ودنیا کی مصلحتوں کے لئے ہوئی ہے۔

پھر موصوف نے اس کے متعلق تفصیلات ذکر کی ہیں جو لائق مطالعہ ہیں، اس مسلمہ مقدمہ سے معلوم ہوا کہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کوئی قول وعمل مصلحت سے خالی نہیں ہوگا؛ لہٰذا فاضل محترم کی یہ تیسری قسم بجائے خود محل نظر ہے۔

(۵) اس تیسری قسم کی چونکہ فاضل محترم کے نزدیک خاص اہمیت ہے؛ اس لئے اس کی پانچ مثالیں پیش کی ہیں ان میں سے پہلی مثال یہ ہے۔

''بخاری شریف میں ایک باب ہے "باب الصلوة قبل المغرب" كتاب التجهد باب ۳۵ حديث ۱۱۸۳) نبی نے فرمایا مغرب سے پہلے نفلیں پڑھو یہ بات دومرتبہ فرمائی پھر تیسری مرتبہ "لمن شاء" بڑھادیا یعنی مغرب سے پہلے کوئی نفلیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے، راوی کہتے ہیں کہ آپ نے "لمن شاء" اس لئے بڑھایا کہ لوگ اس کو سنت نہ بنالیں: "كراهيةً أن يتخذها الناس سنةً" اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ لوگ اس نماز کو سنت نہ بنالیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث اور سنت الگ الگ چیزیں ہیں الخ (بلفظہ)

(ج) موصوف ایک وسیع النظر عالم ہیں پھر بھی اس حدیث پاک میں وارد لفظ سنت کو اصطلاحی معنی پر محمول کررہے ہیں؛ جبکہ انھیں اس بات کا ضرور علم ہوگا کہ جس عہد خیر مہد میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اس وقت لفظ سنت کے لئے یہ موجودہ مستعمل اصطلاحی معنی وضع ہی نہیں ہوا تھا کیونکہ یہ اصطلاحات دوسری صدی ہجری اور اس کے بعد کے زمانے میں وضع ہوئی ہیں، تو اس لفظ کے استعمال کے وقت جو معنی وجود ہی میں نہیں آیا تھا وہ یہاں کیوں کر مراد ہوسکتا ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں "ومعنى قوله سنة" أي شريعة وطريقة لازمة" (فتح الباری،

ج:۳،ص:٦۷) راوی کے قول ''سنت'' کا معنی شریعت اور لازمی طریقہ کے ہیں، لہٰذا اس جملہ کا صاف مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے آخر میں لفظ "لمن شاء" اس لئے زیادہ فرمایا کہ آپ کو پسند نہیں تھا کہ اس دوگانہ نفل کو لوگ لازمی طریقہ بنالیں۔ ملحوظات میں اس مسئلہ کی پوری وضاحت گذر چکی ہے اسے ملاحظہ کرلیا جائے۔

آخر میں عرض ہے کہ صحیح بخاری کی یہ روایت جس کے بارے میں ہمارے فاضل محترم بتارہے ہیں کہ یہ حدیث ہے سنت نہیں ہے، اسی حدیث پاک کو مشہور مستند شارح حدیث امام نوویؒ نے شرح مسلم میں سنت قرار دیا ہے۔ چنانچہ جن علماء نے اس نفل کی عدم ادائیگی کی ترجیح میں یہ کہا ہے کہ اس کا پڑھا جانا مغرب کے فرض میں تاخیر کا سبب بنے گا؛ حالانکہ اس کی تعجیل مطلوب ہے، ان کی اس بات کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں "قول من قال: إن فعلهما يؤدي إلى تاخير المغرب من أول وقتها خيال فاسد منابذ للسنة" جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس دوگانہ کا پڑھنا نماز مغرب کو اس کے اوّل وقت سے مؤخر کردینے کا سبب بنے گا یہ خیال فاسد سنت مخالف ہے۔ بہرحال اگرچہ فاضل محترم بتارہے ہیں کہ یہ حدیث ہے اس لئے حجت نہیں ہے جبکہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص وابی بن کعب، ابودرداء وابوموسیٰ اشعری جیسے فقہائے صحابہ اور تابعین میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، عبداللہ بن بریدہ، یحییٰ بن عقیل وغیرہ رضی اللہ عنہم اور فقہائے مجتہدین میں امام احمد اور اسحاق بن راہویہ نہ صرف اسے حجت مانتے ہیں بلکہ اس پر عمل پیرا بھی تھے اور جو عمل پیرا نہیں ہیں وہ لوگ بھی اباحت پر اس سے استدلال کرتے ہیں تو اس کو سنت ہونا چاہئے۔ (دیکھئے فتح الباری، ج۲،ص:۱۳۸)

(٦) دوسری مثال یہ پیش کی ہے:

''نبی ﷺ نے زندگی میں ایک مرتبہ ایک قوم کی کوڑی پر کھڑے ہوکر پیشاب فرمایا'' یہ حدیث ہے سنت نہیں ہے، آپ ہمیشہ بیٹھ کر پیشاب فرماتے، پھر حضور نے کھڑے ہوکر پیشاب کیوں فرمایا، مسئلہ کی وضاحت کے لئے۔

(ج) بیٹھ کر پیشاب کرنا بلاشبہ اسلامی طریقہ ہے، اسی لئے جمہور علماء اسلام

کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کو فعل ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں، جبکہ ایک جماعت اسے مباح سمجھتی ہے، چنانچہ علامہ عینی لکھتے ہیں:

وقد اختلف العلماء في هذا، فأباحه قوم، وقال ابن المنذر: ثبت أن عمر، وابنه، وزيد بن ثابت، وسهل بن سعد إنّهم بالوا قيامًا وأباحه سعيد بن المسيب، وعروة، ومحمد ابن سيرين، وزيد بن الأصم، وعَبِيدة السلماني، والنخعي، والحكم، والشعبي، وأحمد، وآخرون، وقال مالك إن كان في مكان لايتطائر عليه منه شئى فلا بأس، وإلّا فمكروه، وقالت عامة العلماء البول قائمًا مكروه إلا لعذر، وهي كراهة تنزيه لا تحريم.

وكذلك روي البول قائمًا عن أنس، وعلى بن أبى طالب وأبي هريرة رضي الله عنهم، وكرهه ابن مسعود، وإبراهيم بن سعد (عمدۃ القاری، ج:۳،ص:۱۳۵)

اس مسئلہ میں علماء مختلف ہیں، ایک جماعت نے اسے مباح ٹھہرایا ہے، حافظ ابن المنذر نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر، عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت، سہل بن سعد رضی اللہ عنہم کے بارے میں ثابت ہے کہ ان حضرات نے کھڑے ہوکر پیشاب کیا ہے، اور سعید ابن مسیّب، عروہ ابن زبیر، محمد ابن سیرین، زید ابن الاصم، عبیدہ سلمانی، ابراہیم نخعی، حکم ابن عتیبہ، عامر شعبی، احمد ابن حنبل وغیرہ رحمہم اللہ کھڑے ہوکر پیشاب کو جائز ٹھہراتے ہیں اور امام مالک نے فرمایا ہے کہ اگر ایسی جگہ ہو کہ پیشاب کی چھینٹ اڑکر پیشاب کرنے والے پر نہ آئے تو کھڑے ہوکر پیشاب کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، اور اگر چھینٹ اوپر آتی ہو تو مکروہ ہوگا، اور عام علماء کہتے ہیں کہ بغیر عذر کے کھڑے ہوکر پیشاب کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔

یہ تفصیل بتارہی ہے کہ صحابہ وتابعین آنحضرت ﷺ کے اس فعل کو حجت مانتے ہیں اسی لئے کھڑے ہوکر پیشاب کو روا سمجھا، پھر فاضل محترم کا یہ کہنا کہ مسئلہ کی وضاحت کے لئے حضور ﷺ نے کھڑے ہوکر پیشاب کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ موصوف کے بقول نبی کریم کا یہ فعل حدیث ہے اور حدیث ان کے نزدیک حجت نہیں ہے، تو اس فعل سے مسئلہ

کی وضاحت کیونکر ہوگی؟ عجیب انتشار ہے، ایک طرف تو اس فعل کو حدیث کا عنوان دے کر اس کی حجیت سے انکار کررہے ہیں، دوسری طرف اسی حجیت سے عاری حدیث سے بحالت عذر کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کے جواز پر استدلال واحتجاج بھی کررہے ہیں۔

(۷) تیسری مثال میں لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ نبی ﷺ نے حیض کے زمانہ میں حضرت عائشہ سے فرمایا لنگی باندھ کر میرے ساتھ لیٹ جاؤ، یہ مسئلہ کا بیان ہے سنت نہیں ہے۔ واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ آپ اور حضرت عائشہ ساتھ لیٹے ہوئے تھے، رات میں حضرت عائشہ کا حیض شروع ہوگیا وہ چپکے سے کھڑی ہوگئیں، ایسے موقع پر عورتیں لنگوٹ وغیرہ باندھتی ہیں، آپ کی آنکھ کھل گئی، آپ نے پوچھا کیا ماہواری شروع ہوگئی؟ انھوں نے کہا: ہاں یارسول اللہ! آپ نے فرمایا جو کپڑے باندھنے ہیں وہ باندھ لو پھر لنگی پہن کر میرے ساتھ لیٹ جاؤ، کیونکہ رات آدھی ہوگئی تھی، گھر میں کوئی چراغ نہیں... اس لئے آپ نے فرمایا لنگی باندھ کر میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔

یہ زندگی میں ایک مرتبہ کا واقعہ ہے، مسئلہ کا بیان ہے سنت نہیں ہے، جب حضرت عائشہ یہ واقعہ بیان کرتیں تو ساتھ ہی یہ بھی کہتیں "وأيكم يملك إربه" تم میں سے کون اپنی خواہش پر کنٹرول کرسکتا ہے؟ یعنی اسے سنت سمجھ کر حالت حیض میں بیوی کو ساتھ نہ لٹاؤ ورنہ گناہ میں مبتلا ہوجاؤ گے" (بلفظہ)

(ج) فاضل محترم کی اس طویل عبارت سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

(الف) موصوف اس واقعہ کی منظرتراشی ان الفاظ میں کررہے ہیں، رات آدھی ہوگئی ہے، گھر میں کوئی چراغ نہیں ہے اس سے یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ بحالت حیض ساتھ لٹانا بدرجہ مجبوری تھا۔

(ب) یہ زندگی میں ایک مرتبہ کا واقعہ ہے۔

(ج) حضرت عائشہ جب اس واقعہ کا ذکر کرتیں تو ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کرتیں کہ تم لوگ سنت سمجھ کر ایسا مت کرنا ورنہ مبتلائے گناہ ہوجاؤ گے۔

کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کو فعل ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں، جبکہ ایک جماعت اسے مباح سمجھتی ہے، چنانچہ علامہ عینی لکھتے ہیں:

وقد اختلف العلماء في هذا، فأباحه قوم، وقال ابن المنذر: ثبت أن عمر، وابنه، وزيد بن ثابت، وسهل بن سعد إنّهم بالوا قيامًا وأباحه سعيد بن المسيب، وعروة، ومحمد ابن سيرين، وزيد بن الأصم، وعَبِيدة السلماني، والنخعي، والحكم، والشعبي، وأحمد، وآخرون، وقال مالك إن كان في مكان لايتطائر عليه منه شئى فلا بأس، وإلّا فمكروه، وقالت عامة العلماء البول قائمًا مكروه إلا لعذر، وهي كراهة تنزيه لا تحريم.

وكذلك روي البول قائمًا عن أنس، وعلى بن أبى طالب وأبي هريرة رضي الله عنهم، وكرهه ابن مسعود، وإبراهيم بن سعد (عمدۃ القاری، ج:۳،ص:۱۳۵)

اس مسئلہ میں علماء مختلف ہیں، ایک جماعت نے اسے مباح ٹھہرایا ہے، حافظ ابن المنذر نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر، عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت، سہل بن سعد رضی اللہ عنہم کے بارے میں ثابت ہے کہ ان حضرات نے کھڑے ہوکر پیشاب کیا ہے، اور سعید ابن مسیّب، عروہ ابن زبیر، محمد ابن سیرین، زید ابن الاصم، عبیدہ سلمانی، ابراہیم نخعی، حکم ابن عتیبہ، عامر شعبی، احمد ابن حنبل وغیرہ رحمہم اللہ کھڑے ہوکر پیشاب کو جائز ٹھہراتے ہیں اور امام مالک نے فرمایا ہے کہ اگر ایسی جگہ ہو کہ پیشاب کی چھینٹ اڑکر پیشاب کرنے والے پر نہ آئے تو کھڑے ہوکر پیشاب کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، اور اگر چھینٹ اوپر آتی ہو تو مکروہ ہوگا، اور عام علماء کہتے ہیں کہ بغیر عذر کے کھڑے ہوکر پیشاب کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔

یہ تفصیل بتارہی ہے کہ صحابہ وتابعین آنحضرت ﷺ کے اس فعل کو حجت مانتے ہیں اسی لئے کھڑے ہوکر پیشاب کو روا سمجھا، پھر فاضل محترم کا یہ کہنا کہ مسئلہ کی وضاحت کے لئے حضور ﷺ نے کھڑے ہوکر پیشاب کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ موصوف کے بقول نبی کریم کا یہ فعل حدیث ہے اور حدیث ان کے نزدیک حجت نہیں ہے، تو اس فعل سے مسئلہ

کی وضاحت کیونکر ہوگی؟ عجیب انتشار ہے، ایک طرف تو اس فعل کو حدیث کا عنوان دے کر اس کی حجیت سے انکار کررہے ہیں، دوسری طرف اسی حجیت سے عاری حدیث سے بحالت عذر کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کے جواز پر استدلال واحتجاج بھی کررہے ہیں۔

(۷) تیسری مثال میں لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ نبی ﷺ نے حیض کے زمانہ میں حضرت عائشہ سے فرمایا لنگی باندھ کر میرے ساتھ لیٹ جاؤ، یہ مسئلہ کا بیان ہے سنت نہیں ہے۔ واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ آپ اور حضرت عائشہ ساتھ لیٹے ہوئے تھے، رات میں حضرت عائشہ کا حیض شروع ہوگیا وہ چپکے سے کھڑی ہوگئیں، ایسے موقع پر عورتیں لنگوٹ وغیرہ باندھتی ہیں، آپ کی آنکھ کھل گئی، آپ نے پوچھا کیا ماہواری شروع ہوگئی؟ انھوں نے کہا: ہاں یارسول اللہ! آپ نے فرمایا جو کپڑے باندھنے ہیں وہ باندھ لو پھر لنگی پہن کر میرے ساتھ لیٹ جاؤ، کیونکہ رات آدھی ہوگئی تھی، گھر میں کوئی چراغ نہیں... اس لئے آپ نے فرمایا لنگی باندھ کر میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔

یہ زندگی میں ایک مرتبہ کا واقعہ ہے، مسئلہ کا بیان ہے سنت نہیں ہے، جب حضرت عائشہ یہ واقعہ بیان کرتیں تو ساتھ ہی یہ بھی کہتیں "وأيكم يملك إربه" تم میں سے کون اپنی خواہش پر کنٹرول کرسکتا ہے؟ یعنی اسے سنت سمجھ کر حالت حیض میں بیوی کو ساتھ نہ لٹاؤ ورنہ گناہ میں مبتلا ہوجاؤ گے" (بلفظہ)

(ج) فاضل محترم کی اس طویل عبارت سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

(الف) موصوف اس واقعہ کی منظر تراشی ان الفاظ میں کررہے ہیں، رات آدھی ہوگئی ہے، گھر میں کوئی چراغ نہیں ہے اس سے یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ بحالت حیض ساتھ لٹانا بدرجہ مجبوری تھا۔

(ب) یہ زندگی میں ایک مرتبہ کا واقعہ ہے۔

(ج) حضرت عائشہ جب اس واقعہ کا ذکر کرتیں تو ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کرتیں کہ تم لوگ سنت سمجھ کر ایسا مت کرنا ورنہ مبتلائے گناہ ہوجاؤ گے۔

مگر اسے کیا کیجئے کہ موصوف کی ان تینوں باتوں میں سے کسی ایک کو بھی نہ صرف یہ کہ روایات کی تائید حاصل نہیں ہے بلکہ حدیث کی روایتوں سے سارا معاملہ ان کے برعکس ثابت ہورہا ہے، مسئلہ زیر بحث سے متعلق حضرت عائشہ صدیقہ اور دیگر امہات المؤمنین سے مروی احادیث نقل کی جارہی ہیں انھیں ملاحظہ کر کے فیصلہ خود کیجئے۔

حدیث ۱ : قال خِلاس الهَجَري: سمعت عائشة تقول: كنت أنا ورسول الله صلى الله عليه وسلم نبيت في الشعار الواحد وأنا حائض وطامث، الحديث" (سنن ابوداؤد، ج:۱،ص:۳۵ وقال المنذري أخرجه النسائي وهو حسن مختصر سنن أبي داؤد، ج:۱،ص:۱۳۵)

میں نے حضرت عائشہ سے فرماتے ہوئے سنا کہ میں اور اللہ کے رسول ﷺ (ہم دونوں) ایک ہی چادر میں رات گزارتے تھے حالانکہ میں حالت حیض میں ہوتی۔

حدیث ۲ : عن عمرو بن أبي سلمة عن ابيه عن عائشة رضي الله عنها أنها كانت تنام مع رسول الله صلى الله عليه وسلم وهي حائض، وبينهما ثوب" (التمہید لابن عبدالبر، ج:۳،ص:۱۶۶و قال إسناد حديث عائشة صحيح، وذكره الحافظ البوصيري في اتحاف الخيرة المهرة بزوائد المسانيد العشره، ج:۲،ص:۶ وقال هذا إسناد رجاله ثقات)

حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سوتی تھیں؛ حالانکہ وہ بحالت حیض ہوتیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ کی حدیثوں کے الفاظ کی ترکیب بتارہی ہے کہ یہ مستمر معمول تھا، ایک مرتبہ کا واقعہ نہیں ہے۔

حدیث ۳ : حضرت ام سلمہ بیان کرتی ہیں کہ میں ایک چادر میں رسول خدا ﷺ کے ساتھ سوئی تھی کہ میرا حیض شروع ہوگیا، میں چپکے سے آپ ﷺ کے پاس سے اٹھ گئی اور حیض کے زمانے میں پہنے جانے والے کپڑے کو پہن لیا، آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا کیا تجھے حیض آگیا؟ میں نے کہا: ہاں "فدعاني فاضطجعت معه في الخميصة"

تو آنحضرت ﷺ نے مجھے بلایا کہ آؤ لیٹ جاؤ تو میں آپ کے ساتھ چادر میں لیٹ گئی (صحیح بخاری مع فتح الباری، ج:۱،ص:۵۳۰ وصحیح مسلم مع شرح النووی، ج:۱،ص:۱۴۲)

حدیث ۴ : ام المومنین حضرت میمونہ کا بیان ہے کہ كان رسول الله ﷺ ينضجع معي وأنا حائض وبيني وبينه ثوب (صحیح مسلم، ج:۱،ص:۱۴۲)

آنحضرت ﷺ میرے ساتھ لیٹے تھے، حالانکہ میں حیض سے ہوتی میرے اور آپ ﷺ کے درمیان کپڑا حائل ہوتا۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت کے الفاظ سے بھی بظاہر یہی معلوم ہورہا ہے کہ یہی ہمیشہ کا معمول تھا کوئی ایک بار کا واقعہ نہیں ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ فاضل محترم یہ فرمادیں کہ یہ سب تو سنت نہیں احادیث ہیں اور احادیث حجت نہیں ہیں؛ اس لئے ایک ایسی حدیث پیش کی جارہی ہے جسے سنت وحجت ماننے میں شاید موصوف کو بھی تامل نہ ہو اور احتیاطاً ترجمہ کی بجائے حدیث کے الفاظ نقل کئے جارہے ہیں۔

حدیث ۵ : عن الزهري قال: اخبرني حبيب مولى عروة بن الزبير أن نُدبة مولاة ميمونة زوج النبي صلى الله عليه وسلم أخبرته أنها أرسلتها ميمونة إلى عبد الله بن عباس في رسالة، فدخلت عليه فإذا فراشه معزول عن فراش امرأته، فرجعت إلى ميمونة فبلّغها رسالتها ثم ذكر ذلك فقالت لها ميمونة: ارجعي إلى امرأته فسليها عن ذلك، فرجعت إليها فسألتها عن ذلك فاخبرتها أنها إذا طمست عزل أبو عبدالله فراشه عنها فأرسلت ميمونة إلى عبد الله بن عباس فتغيظت عليه، وقالت: أترغب عن سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم، فوالله إن كانت المرأة من أزواجه لتأزر بالثوب ما يبلغ أنصاف فخذيها ثم يباشرها بسائر جسدها (السنن الكبرى للبيهقي واللفظ له ج:۱،ص:۳۱۳، ورواه عبدالرزاق في مصنّفه ج۱، ص:۳۲۱، والنسائي في سننه ج۱،ص:۴۵)

آنحضرت ﷺ کی زوجۂ مطہرہ میمونہ کی باندی نُدبہ نے بیان کیا کہ انھیں حضرت

میمونہ نے (اپنے بھانجے) عبداللہ بن عباسؓ کے یہاں کسی پیغام کے لئے بھیجا یہ حضرت عبداللہ بن عباس کے گھر گئیں تو دیکھا کہ ان کا بستر بیوی کے بستر سے الگ ہے، وہاں سے واپس لوٹیں اور حضرت میمونہ کو ان کا مطلوبہ پیغام پہنچادیا بعد ازاں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ان کی بیوی کے بستروں کی علاحدگی کا تذکرہ کیا، تو حضرت میمونہ نے ان سے کہا عبداللہ بن عباسؓ کی بیوی کے پاس جا اور اس کے متعلق پوچھ، تو وہ لوٹ کر ان کے پاس گئیں اور ان سے بستروں کے الگ الگ ہونے کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ جب میں حیض سے ہوتی ہوں تو اُن کے شوہر عبداللہ بن عباسؓ اپنا بستر ان سے الگ کر لیتے ہیں۔ (ندبہ نے واپس آکر حضرت میمونہ کو یہ بات بتائی) تو حضرت میمونہ نے عبداللہ بن عباسؓ کو بلا بھیجا (وہ آئے) تو انھیں ڈانٹ پلائی، اور کہا کیا تو رسول اللہ ﷺ کی سنت (طریقہ) سے اعراض کرتا ہے، بخدا آپ ﷺ کی بیویاں (حیض کے زمانہ میں) (ناف سے لے کر) آدھی رانوں تک کپڑا باندھ لیا کرتی تھیں پھر آپ ﷺ ان کے (کپڑے سے مستور حصہ بدن کے علاوہ) سارے جسم سے مباشرت فرماتے تھے۔

ان صحیح احادیث کو بغور پڑھئے، کیا فاضل محترم کی بیان کردہ کوئی بات ان سے میل کھارہی ہے، موصوف کو اصرار ہے کہ یہ سنت نہیں؛ بلکہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے اور وہ بھی بوجہ مجبوری، جبکہ یہ زوجات مطہرات، بالخصوص ام المومنین حضرت میمونہ رضوان اللہ علیہن صاف اور واضح لفظوں میں بتارہی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی یہ سنت وعادت تھی کہ ایام مخصوص میں بھی آپ ان کے ساتھ ایک ہی بستر پر لیٹا کرتے تھے۔

(۴) آخر میں فاضل محترم لکھتے ہیں کہ ''جب حضرت عائشہ یہ واقعہ بیان کرتیں تو ساتھ یہ بھی کہتیں! "وأيكم يملك إِرْبَه" تم میں سے کون اپنی خواہش پر کنٹرول کرسکتا ہے؟ یعنی اس کو سنت سمجھ کر حالت حیض میں بیوی کو ساتھ نہ لٹاؤ ورنہ گناہ میں مبتلا ہوجاؤ گے۔ (بلفظہ)

موصوف کی اس عبارت میں دو باتیں محل نظر ہیں: (۱) آں موصوف نے اس

مثال میں جس حدیث کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ نے حیض کے زمانہ میں حضرت عائشہؓ سے فرمایا لنگی باندھ کر میرے ساتھ لیٹ جاؤ، اس حدیث کو امام مالکؒ نے ''مؤطا'' میں اپنے شیخ ربیعۃ الرائیؒ سے منقطعاً اور امام بیہقی نے ''السنن الکبریٰ'' میں عطا بن یسارؒ سے موصولاً ان الفاظ میں روایت کیا ہے۔

عن عائشة قالت: كنت مع رسول الله في لحاف واحد، فانسللت، فقال: ما شأنك؟ فقلت: حضت، فقال شدي عليك إزارك ثم ادخلي" (واللفظ للبيهقي) اس روایت کے بارے میں حافظ ابن عبدالبر التمہید میں لکھتے ہیں کہ ولا أعلم أنه روى من حديث عائشة بهذا اللفظ البتة" (ج:۳،ص:۱۶۲) اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس روایت میں "أيكم أملك إِرْبَه" کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ یہ الفاظ ایک دوسری حدیث کے ہیں جو سند اور متن ہر لحاظ سے اس سے الگ ہے، اس لئے موصوف کا یہ کہنا کہ ''حضرت عائشہ'' جب یہ واقعہ بیان کرتیں تو ساتھ ہی یہ بھی کہتیں "أيكم أملك إِرْبه" درست نہیں ہے؛ بلکہ یہ "إدخال متن في متن آخر" کے قبیل سے ہے جس کا حکم آں موصوف اچھی طرح جانتے ہوں گے۔

(۲) پھر فاضل محترم نے حضرت عائشہ کے جملہ "وأيكم يملك إربه" کا معنی و مراد یہ بیان کیا ہے کہ ''تم میں سے کون اپنی خواہش نفس پر کنٹرول کرسکتا ہے؟ یعنی اس کو سنت سمجھ کر حالت حیض میں بیوی کو ساتھ نہ لٹاؤ ورنہ گناہ میں مبتلا ہوجاؤ گے۔

حضرت عائشہ صدیقہ کی اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن عائشة قالت: كانت إحدانا إذا كانت حائضاً فأراد رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يباشرها أمرها أن يتّزر في فور حيضها ثم يباشرها، قالت: وأيكم يملك إربه، كما كان النبى صلى الله عله وسلم يملك إربه (صحیح بخاری بشرح فتح الباری، ج:۱،ص:۵۳۲، وصحیح مسلم بشرح نووی ج:۱،ص:۱۴۱)

یعنی حضرت عائشہ نے جب یہ حدیث بیان کی تو اس کے آخر میں فرمایا اور تم میں سے کون اپنے جی کی خواہش پر یوں قابو یافتہ ہے جس طرح اللہ کے نبی ﷺ اپنی خواہش

پر قابو رکھتے تھے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ آں محترم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس تشبیہی قول میں یہ تصرف کیا کہ اس کے جز ''مشبہ بہ'' کما کان النبی الخ کو حذف کر دیا اور مشبہ کو ایک مستقل جملہ بنا دیا، اور اس میں واقع لفظ ''من'' استفہامیہ کو استفہام انکاری کے معنی پر محمول کر کے اوپر مذکور مطلب برآمد کر لیا، موصوف کے اس مطلب کے برعکس حافظ ابن حجر عسقلانی اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

والمراد، أنه كان أملك الناس لأمره فلا يخشى عليه ما يخشى على غيره من أن يحوم حول الحمى، ومع ذلك، فكان يباشر فوق الإزار تشريعاً لغيره.

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے قول کی مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کو اپنے معاملہ پر سب سے زیادہ قابو تھا، لہٰذا آپ ﷺ کے حق میں وہ اندیشہ نہیں ہوسکتا تھا، جو اندیشہ دیگر لوگوں کے متعلق اس موضع ممنوع کے قریب گھومنے سے کیا جاتا ہے، اس عدم اندیشہ کے باوجود آپ امت کے لئے حکم شرعی بیان کرنے کی غرض سے مباشرت فوق الازار یعنی ناف سے اوپر گھٹنے سے نیچے کرتے تھے۔

آں محترم کے بیان کردہ مطلب اور حافظ عسقلانیؒ کی بیان کی ہوئی مراد میں فرق کس نوعیت اور درجہ کا ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔

(۸) چوتھی مثال پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

ایک مرتبہ جب تکبیر ہوئی تو نبی ﷺ اپنی نواسی کو گود میں لئے ہوئے گھر سے تشریف لائے اور اس بچی کو گود میں اٹھائے ہوئے نماز پڑھائی جب سجدہ کرتے بچی کو نیچے بٹھا دیتے، اگلی رکعت میں پھر اس کو گود میں لے لیتے تھے، آپ نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ یہ عمل کیا ہے اور یہ بھی مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھا... اب اگر کوئی یہ کہے کہ یہ سنت ہے اور وہ چھوٹے بچے کو گود میں لے کر نماز پڑھے تو اس سے کہا جائے گا یہ سنت نہیں ہے، یہ عمل تو مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھا، پس یہ حدیث ہے، سنت نہیں۔

(ج) (۱) فاضل محترم نے جس حدیث پاک کی اپنے الفاظ میں یہ تعبیر کی ہے اس کے اصل الفاظ ملاحظہ کیجئے۔

عن أبي قتادة الأنصاري قال: رأيت النبي صلى الله عليه وسلم يؤمّ الناس وأمامة بنت أبي العاص وهي بنت زينب بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم على عاتقه فإذا ركع وضعها وإذا رفع من السجود أعادها. (صحیح مسلم بشرح نووی، ج:۱،ص:۲۰۵)

میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے اور امامہ بنت ابی العاص - جو آپ کی صاحبزادی زینب کی بیٹی ہیں - آپ کے کندھے پر ہیں جب رکوع کیا تو انھیں زمین پر رکھ دیا اور جب سجدوں سے اٹھے تو انھیں پھر کندھے پر اٹھا لیا (ایک روایت میں على عاتقه کی بجائے على عنقه کے الفاظ ہیں عنق کے معنی گردن کے ہیں۔

بچے کو کندھے یا گردن پر رکھ کر سنت کے مطابق قیام بآسانی کیا جا سکتا ہے، لیکن گود میں لے کر اس طرح قیام ممکن نہیں، موصوف نے عاتق وعنق کا معنی گود سے پتہ نہیں کیوں کیا، جبکہ اردو محاورہ میں بھی گود میں لینے اور کندھے پر بٹھانے میں فرق ہے کندھے پر بٹھانے کو گود میں لینا نہیں کہا جاتا ہے، کتاب وسنت کی نصوص کے تراجم میں اس طرح کی سہل پسندی محتاط علماء کی نظروں میں پسندیدہ نہیں ہے۔

امام نوویؒ اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

فيه دليل لصحة صلوٰة من حمل آدميًا أو حيوانا طاهرا من طير وشاة وغيرهما، وأن ثياب الصبيان وأجسادهم طاهرة حتى يتحقق نجاستها، وان الفعل القليل لا تبطل الصلوٰة، وأن الأفعال إذا تعدت ولم تتوال بل تفرقت لا تبطل الصلوٰة...

بعض ضروری مباحث پر گفتگو کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:

فالصواب الذي لا معدل عنه أن الحديث كان لبيان الجواز، والتنبيه

علی هذه الفوائد فهو جائز لنا و شرع مستمر للمسلمین الی یوم الدین.

یہ حدیث درج ذیل احکام کی حجت ودلیل ہے۔

(۱) جو شخص کسی پاک آدمی یا جانور چڑیا یا بکری کو اپنے اوپر اٹھا کر نماز پڑھے تو نماز صحیح ہے، (۲) بچوں کے کپڑے یا بدن پر نجاست جب تک ظاہر ومعلوم نہ ہو وہ پاک ہیں، (۳) عمل قلیل نماز کو باطل نہیں کرتا، (۴) افعال مذکورہ جبکہ پے در پے نہ ہوں؛ بلکہ الگ الگ ہوں نماز کو باطل نہیں کرتے وغیرہ۔

لہٰذا صواب اور درست بات جس سے ہٹا نہیں جاسکتا یہی ہے کہ یہ حدیث بیانِ جواز نیز ان فوائد پر متنبہ کرنے کے لئے ہے، پس یہ عمل ہمارے لئے جائز ہے اور قیامت تک کے لئے ہم مسلمانوں کے حق میں حکم شرعی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس کو طریقہ اور عادت نہیں بنایا جاسکتا ہے لیکن اگر یہ صورت کبھی پیش آجائے تو اس کا حکم کیا ہے آنحضرت ﷺ نے اپنے عمل سے اس کا حکم بیان کردیا لہٰذا اگر آپ کے اس عمل کو اپنی جانب سے کوئی نام دے کر اس کی حجیت سے انکار کردیا جائے تو پھر اس کے لئے دلیل شرعی کیا چیز ہوگی؟

اسی مسئلہ سے متعلق ایک اور حدیث ملاحظہ کریں۔

عن أبي هريرة قال: كنا نصلي مع النبي صلى الله عليه وسلم العشاء فإذا سجد وثب الحسن والحسين على ظهره فاذا رفع رأسه أخذهما من خلفه أخذا رفيقاً ويضعهما على الأرض فإذا عاد، عادا حتى قضى صلوته، (منتقی الاخبار بشرح نیل الاوطار، ج:۲،ص:۱۳۷)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے، تو آپ ﷺ جب سجدہ میں گئے حسن وحسین کود کر آپ ﷺ کی پشت پر بیٹھ گئے، پھر آپ نے جب سجدہ سے سر اٹھانے کا ارادہ فرمایا تو نواسوں کو پیچھے سے آہستگی ونرمی کے ساتھ پکڑا اور زمین پر رکھ دیا آپ جب پھر سجدہ میں گئے تو یہ دونوں پھر پشت پر آبیٹھے۔ (آنحضرت ﷺ کا انھیں نرمی سے پکڑ کر زمین پر رکھنا اور ان کا بوقت

سجدہ کود کر پشت پر آجانا جاری رہا) یہاں تک کہ آپ نے نماز پوری فرمالی۔

(۲) اسی چوتھی مثال کے تحت چھوٹے بچوں کا مساجد میں داخل ہونے کا مسئلہ بھی ذکر کیا ہے چنانچہ ''ناسمجھ بچوں کا مسجد میں لانا ممنوع ہے'' کا عنوان قائم کرکے اس ممانعت کی دلیل میں ابن ماجہ کی یہ روایت پیش کی ہے "جنّبوا مساجدکم صبیانکم" اپنی مسجدوں کو اپنے (ناسمجھ) بچوں سے بچاؤ جب تک بچے پاکی ناپاکی کو نہ سمجھیں اور مسجد کا احترام نہ جانیں، بچوں کو مسجد میں لانا منع ہے، لوگ یہ حدیث پیش کرتے ہیں، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ عمل مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھا، سنت نہیں تھا'' (بلفظہ)

حیرت ہے کہ نواسی رسول ﷺ امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا سے متعلق یہ حدیث جو اعلیٰ درجہ کی صحیح حدیث ہے، جس کی شرح کے تحت حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، حافظ عینیؒ وغیرہ شراح حدیث بصراحت لکھتے ہیں کہ: اس حدیث سے بچوں کو مسجد میں لانے کا جواز ثابت ہوتا ہے، اس کے بارے میں تو فرمارہے ہیں کہ لوگ یہ حدیث پیش کرتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ عمل مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھا سنت نہیں'' یعنی مساجد میں ادخال صبیان کے جواز پر اس حدیث سے استدلال نہ کیا جائے، (واللہ اعلم) اور اس کے مقابلہ میں ابن ماجہ کی یہ روایت پیش کررہے ہیں "جنبوا مساجدکم صبیانکم" جبکہ یہ روایت انتہائی ضعیف اور لائق استدلال واحتجاج نہیں ہے؛ کیونکہ اس میں ایک راوی ''حارث بن نبہان'' متروک ہیں اور ان کے شیخ ''عتبہ بن یقظان'' ضعیف ہیں اور ان کے شیخ ابوسعیدؒ مجہول ہیں، اور ان کے شیخ ''مکحول'' اگرچہ متفق علیہ امام حدیث وفقہ ہیں اور اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہیں، لیکن ان کی لقاء حضرت واثلہ بن اسقع سے جن سے یہ روایت کررہے ہیں مختلف فیہ ہے، یہ حال ہے اس روایت کا جس سے موصوف استدلال فرمارہے ہیں (۱)۔

مزید وضاحت کے لئے ذیل میں بچوں کے مساجد میں لانے یا آنے سے متعلق

(۱) ان مذکورہ راویوں کے لئے دیکھئے، تہذیب التہذیب، وتہذیب الکمال وغیرہ۔

چند احادیث صحیحہ نقل کی جارہی ہیں۔

(الف) عن أنس كان رسول الله يسمع بكاء الصبيّ وهو في الصلوٰة فيقرأ بالسورة الخفيفة أو بالسورة القصيرة. (صحیح مسلم بشرح نووی، ج:۱،ص:۱۸۸)

آنحضرت ﷺ بحالتِ نماز چھوٹے بچہ کے رونے کو سنتے تو ہلکی یا چھوٹی سورۃ قرأۃ کرتے تھے۔

(ب) عن أنس بن مالك قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إني لأدخل في الصلوٰة أريد إطالتها فأسمع بكاء الصبي فأخفف من شدة وجد أمه به (ایضاً)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ میں نماز میں داخل ہوتا ہوں بایں ارادہ کہ اسے دراز اور لمبی کروں گا کہ بچے کے رونے کی آواز میرے کانوں میں آتی ہے، تو اس بچے کے رونے سے اس کی ماں کی شدت غم کی وجہ سے میں نماز کو ہلکی اور مختصر کر دیتا ہوں۔

ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوا کہ جو عورتیں مسجد نبوی میں نماز کے لئے آتی تھیں، وہ اپنے بچوں کو بھی ساتھ لاتی تھیں۔

عن أبي هريرة قال خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم سوق بني قينقاع متكئاً على يدىّ فطاف، ثم رجع فاجتَبَى في المسجد، وقال: اين لكاع، ادعوا لىّ لكاعاً فجاء الحسن فاشتد حتى وثب في جبوته فدخل فمه في فمه ثم قال: اللّٰهم إني أحبّه فأحِبه وأحبّ من يحبّه ثلاثا" (مسند احمد ج۲ ص۵۳۳ رقم الحدیث ۱۰۹۰۴)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ، میرے ہاتھوں پر سہارا کئے ہوئے بنی قینقاع کے بازار میں گئے اور گھومے، پھر واپس آئے اور مسجد میں گوٹ مار کر بیٹھ گئے پھر فرمایا: منّا کہاں ہے؟ میرے پاس منّے کو بلا کر لاؤ، تو حسن آئے اور دوڑتے ہوئے آپ کی گود میں کود کر بیٹھ گئے، آپ ﷺ نے اپنا منہ ان کے منہ سے لگا دیا

پھر یہ دعا فرمائی اے اللہ میں اس سے محبت کرتا ہوں، لہٰذا آپ بھی اس کو اپنا محبوب بنا لیجئے، اور اسے بھی جو اس سے محبت کرے یہ دعا آپ نے تین بار فرمائی۔

(ج) عن بريدة قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يخطبنا، إذ جاء الحسن والحسين - عليهما قميصان أحمران - ويعثران فنزل رسول الله صلى الله عليه وسلم من المنبر فحملهما ووضعهما بين يديه. (الحديث) (مشکوٰۃ بشرح مرقات، ج:۱۱،ص:۳۱۵ اخرجہ اصحاب السنن الاربعۃ)

حضرت بریدہ نے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں خطبہ دے رہے تھے کہ حسنین رضی اللہ عنہما گرتے پڑتے آئے ان کے بدن پر سرخ دھاری کی قمیص تھی، (نواسوں کو اس طرح آتے ہوئے دیکھ کر فرط محبت میں خطبہ موقوف کر کے) منبر سے اترے اور انھیں گود میں اٹھالیا اور اپنے سامنے دونوں کو بٹھادیا (پھر خطبہ میں مصروف ہو گئے)

بغرض اختصار صرف تین احادیث پر اکتفاء کیا جارہا ہے ورنہ اس باب میں مزید حدیثیں پیش کی جاسکتی ہیں، ان مذکور روایتوں میں سے پہلی روایت کی شرح میں امام نوویؒ لکھتے ہیں "وفيه أن الصبي يجوز إدخاله في المسجد وإن كان الأولى تنزيهه المسجد عمن لا يؤمن منه حدث" (ج۱،ص:۱۸۸)

اس حدیث میں دلیل وحجت ہے کہ بچے کو مسجد میں لانا جائز ہے، اگرچہ ایسے بچے جن کے پیشاب پخانہ کر دینے سے اطمینان نہ ہو، تو مسجد کو ان سے پاک صاف رکھنا ہی اولیٰ ہے۔

(۹) بعد ازاں یہ سوال قائم کر کے کہ "ہم کیسے جانیں کہ حضور ﷺ نے یہ جو عمل کیا ہے وہ مسئلہ نہیں ہے، مصلحت ہے، اس کے پہچاننے کی کسوٹی کیا ہے؟ جواب کسوٹی صحابہؓ کا عمل ہے صحابہؓ نے اس پر عمل کیا ہے یا نہیں؟ اگر کیا ہے تو وہ سنت ہے، ورنہ وہ عمل کسی مصلحت سے ہے آپ صحابہؓ کا پورا دور دیکھیں،

۱- کسی صحابیؓ نے کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا۔

۲- ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ کسی صحابیؓ نے حالت حیض میں بیوی کو ساتھ لٹایا ہو۔

۳- اور کبھی بھی کسی صحابی نے بچے کو گود میں لے کر مسجد میں آ کر نماز نہیں پڑھی ہے'' (بلفظہ)

(ج) ۱- آپ دیکھ رہے ہیں کہ فاضلِ محترم دعویٰ پر دعویٰ کئے جا رہے ہیں، مگر دلیل وثبوت ندارد، کسے جرأت ہے کہ آں موصوف کے گوش گزار کر سکے کہ علمی مباحث بالخصوص منقولات میں نقول ہی کام آتی ہیں، دعویٰ محض نہیں، کیونکہ علم وتحقیق کی سلطنت میں یہ سکہ کم عیار ہے۔

جائزہ (٦) میں علامہ عینی کی ''عمدۃ القاری'' کے حوالہ سے یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ، ان کے صاحبزادے عبداللہ، زید بن ثابت، سہل بن سعد رضی اللہ عنہم جیسے کبار صحابہؓ سے کھڑے ہو کر پیشاب کرنا ثابت ہے۔

پھر سید التابعین سعید بن مسیّب، عروۃ بن زبیر، محمد بن سیرین، زید بن اصم، عبیدہ سلمانی، ابراہیم نخعی، حکم بن عتیبہ، عامر شعبی، اور ائمہ اربعہ میں سے امام احمد بن حنبل، اور فقہاء محدثین میں سے اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ وغیرہ کے مذہب میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا مباح ہے، علاوہ ازیں مصنف ابن ابی شیبہ میں جید سند سے حضرت علیؓ کا بحالت قیام پیشاب کرنا ثابت ہے۔ نیز حضرت انس بن مالک اور حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی یہ عمل نقل کیا جاتا ہے، پھر حضرت فاروق اعظمؓ کا یہ قول کہ "البول قائماً أحصن للدبر" امام بیہقی وغیرہ نے بسند قوی ذکر کیا ہے، بایں ہمہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ ''آپ صحابہ کا پورا دور دیکھیں کسی صحابیؓ نے کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا ہے۔ (یا للعجب)

رہا مسئلہ بحالتِ حیض بیوی کے ساتھ لیٹنے کا تو ندبہ کے طریق سے مروی روایت ذکر کی جا چکی ہے، جس میں ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا نے اس حالت میں بیوی کے ساتھ لیٹنے کو اللہ کے رسول ﷺ کی سنت وعادت بتایا ہے، جس کے ترک پر اپنی بہن کے لڑکے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی سرزنش بھی فرمائی، کیا حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ خالہ محترمہ ام المومنین کی اس اطلاع وسرزنش کے باوجود بھی وہ اپنے قدیم طرزِ عمل پر قائم رہے؟

نیز اس روایت سے مستفاد ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کا عام معمول یہی تھا کہ بہر حال زوجین کا ایک ہی بستر ہوا کرتا تھا، اگر ان کی یہ طرز معاشرت نہ ہوتی تو حضرت ابن عباسؓ کے گھر دو بستروں کو دیکھ کر حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے اس کے تذکرہ کی جانب ندبہ کا التفات ہی نہ ہوتا؛ کیونکہ عادت الناس یہی ہے کہ روزمرہ کے معمولات کے بارے میں باہم تذکرہ نہیں کرتے؛ البتہ اگر کوئی نادر، انوکھی چیز سامنے آتی ہے تو اس کے ذکر کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور پھر لوگ اس کو ذکر کئے بغیر نہیں رہتے'' (واللہ اعلم)

ضروری وضاحت

حضرات محدثین اور بالخصوص ائمہ اصول حدیث پاک کے معمول بہا ہونے کے لئے جہاں بعض دیگر امور کا ذکر کرتے ہیں، وہیں یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعد اس پر صحابہ کرامؓ کا عمل رہا ہو، یا ائمہ مجتہدین میں سے کسی نے اسے قبول کیا ہو، اسی وقت اس حدیث پر عمل کیا جائے گا۔ چنانچہ امام ذہبیؒ نے سیر اعلام النبلاء میں ظاہری امام حافظ ابن حزمؒ کے تذکرہ میں ان کے اس قول پر کہ "أنا اتبع الحق، وأجتهد، ولا اتقيد بمذهب" ایک نہایت قیمتی تبصرہ کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو واقعی مرتبہ اجتہاد پر فائز ہے اس کے لئے تقلید کی گنجائش نہیں، جیسے فقیہ مبتدی عامی کے لئے کسی حال میں اجتہاد روا نہیں ہے، اور فقیہ منتہی جو مرتبۂ اجتہاد مقید کا حامل ہے اور اس میں ائمہ کے دلائل پر نظر کی اہلیت پیدا ہو گئی ہے تو جب اس پر حق واضح ہو جائے اور اس حق میں کوئی ایسی نص ثابت ہو جائے، جس پر ائمہ اعلام میں سے کسی نے عمل کیا ہے مثلاً جیسے امام ابوحنیفہؒ، یا جیسے امام مالکؒ، یا سفیان ثوریؒ، یا امام اوزاعیؒ، یا امام شافعیؒ، وابو عبیدؒ واحمدؒ واسحاقؒ، تو وہ اس مسئلہ میں حق کی اتباع کرے الخ (ج ۱۸ ص ۱۹۱)

یہاں یہ تصور صحیح نہیں ہوگا کہ یہ حضرات رسولِ خدا ﷺ کی حدیث کو اس وقت تک اہمیت نہیں دیتے؛ جب تک کہ اس پر امت کے مذکورہ طبقہ کی مہر اخذ وقبول ثبت نہ ہو جائے۔ حدیثِ رسول کی عظمتوں کے ان نگہبانوں کے متعلق یہ خیال ان پر سراسر

زیادتی ہوگی، بلکہ ان بزرگوں کا اذعان ویقین یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سے ثابت شدہ حدیث کے ترک پر پوری امت کا اتفاق ممکن ہی نہیں ہے۔ لہٰذا ذخیرہ احادیث میں وہ روایتیں جن پر نہ صحابہؓ نے عمل کیا ہے اور نہ ہی ائمہ مجتہدین نے تو ان کے نزدیک یہ لازمی طور پر منسوخ ہوں گی۔

اپنے اسی برحق نظریہ کی بناء پر غیر مجتہد کے حق میں یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ براہ راست کسی حدیث پر عمل اس کے لئے اسی وقت روا ہوگا؛ جبکہ وہ حدیث صحابہؓ یا ائمہ اعلامؒ کی معمول بہا ہو ورنہ وہ اپنے علمِ ناقص کی بناء پر منسوخ کو دلیل وحجت ماننے کی خطرناک غلطی میں مبتلا ہوسکتا ہے۔

فاضل محترم نے اپنے مجوّزہ مادہ افتراق کے ضمن میں تیسری قسم کی مثال میں جن پانچ احادیث کو پیش کیا ہے، محدثین واصولیین کے اس ضابطہ کے معیار پر سب کی سب معمول بہا اور حجت ہیں؛ جبکہ آں موصوف کے نزدیک یہ حجت نہیں ہیں۔

(۱۰) آخری پانچویں مثال میں لکھتے ہیں:

انہی مصلحتوں میں ایک مصلحت تعلیمِ امت بھی ہے، جب حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ تشریف لائے تو بیس دن ٹھہرے ہیں اور ساٹھ جہری نمازیں آپ کے پیچھے پڑھی ہیں، ان میں سے تین نمازوں میں آپ ﷺ نے زور سے آمین کہی ہے، یہ جہر حضرت وائل کی تعلیم کے لئے تھا، پس یہ بھی حدیث ہے سنت نہیں ہے۔

(ج) آمین بالسر، یا آمین بالجہر سے متعلق روایتیں سنت ہیں یا حدیث جس کا جو جی چاہے نام رکھ لے، یہ دونوں احادیث تو ان بابرکت حدیثوں میں سے ہیں جن کے مجموعہ پر عمل میں امت متفق ہے صحابۂ کرامؓ کے عہد خیر مہد سے آج تک دونوں پر عمل جاری وساری ہے، اور بلا اختلاف زور سے آمین کہنے کو پسند کرنے والے آہستہ آمین کو بھی جائز سمجھتے ہیں، اسی طرح آہستہ آمین کو اختیار کرنے والوں کے نزدیک بلند آواز سے آمین کہنا بھی روا ہے۔ یہ کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے؛ بلکہ عملی تنوع ہے، جس سے دونوں حدیثوں پر عمل کی راہیں استوار ہوگئی ہیں۔ "فتبارك الله أحسن الخالقين"

پہلے مادہ افتراقی پر تفصیل سے کلام کے بعد لکھتے ہیں:

(۱۱) دوسرا مادۂ افتراقی: اور کچھ چیزیں سنت ہیں مگر حدیث نہیں ہیں وہ خلفائے راشدین کی سنتیں ہیں۔

(ج) ۱- حدیث وسنت کی اصطلاحی تعریف کے ضمن میں یہ بات گذر چکی ہے کہ متقدمین ائمہ حدیث آنحضرت ﷺ سے منقول مرفوع احادیث کو سنت سے اور صحابہ و تابعین کے اقوال وفتاویٰ کو حدیث سے تعبیر کرتے تھے، نیز یہ بات بھی بیان کی جا چکی ہے کہ متاخرین محدثین کا ایک طبقہ صحابۂ کرامؓ کے اقوال کو بھی حدیث کی تعریف میں داخل کرتا ہے، لہٰذا محدثین کی ان دونوں جماعتوں کے نزدیک حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم کے اقوال وغیرہ حدیث ہی ہیں، جبکہ آں موصوف فرمارہے ہیں کہ یہ سنت ہیں حدیث نہیں ہیں۔ ائمہ حدیث کی قدیم، رائج اصطلاح کے مقابلہ میں اس نو پید اصطلاح کا جہانِ علم وفن میں کیا مقام ہے؟ آپ سمجھیں۔

۲- پھر خلفائے راشدین کی سنت کو اسلام کے ایک خاص شعبہ کے ساتھ محدود کردیا گیا ہے، جبکہ حدیث میں لفظ "سنة الخلفاء" مطلق ہے حدیث کے اطلاق کو مقید کرنے کی وجہ اور دلیل ذکر نہیں کی گئی ہے۔ یہ تقیید بھی محل بحث ونظر ہے، مگر یہ مختصر جائزہ اس کا متحمل نہیں ہے۔

موضوع کے بعض متعلقات پر طویل گفتگو کے بعد خلاصہ کلام کے تحت لکھتے ہیں:

(۱۲) میں نے خطبہ میں آیت پڑھی تھی "قل هذه سبيلي أدعوا إلى الله" آپ کہئے یہ میرا راستہ ہے، اسی راستہ کا نام سنت ہے... سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بشکل عنوان یہ انکشاف کیا گیا کہ "حدیث کے حجت ہونے پر کوئی دلیل نہیں" پھر اس بے دلیلی کو اس دلیل سے ثابت کیا گیا ہے کہ "حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا "من تمسك بسنتي عند فساد أمتي فله أجر كذا" اور مشکوٰۃ میں باب ہے "الاعتصام بالكتاب والسنة" اس باب میں چھ روایتیں ہیں، سب میں سنت ہی کا لفظ ہے... پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں "جو لوگ کہتے ہیں کہ حدیث اور سنت ایک

آں محترم نے ابتداء میں سنت کی تعریف "الطريقة المسلوكة في الدين" کے الفاظ سے کی تھی، پھر اس کی وضاحت یوں کی تھی "یعنی دینی راستہ وہ راستہ جس پر مسلمانوں کو چلنا ہے، قرآن میں ہے "قل هذه سبيلي ادعوا الى الله" کہئے یہ میرا راستہ ہے، میں لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں میرا راستہ، یعنی حضور ﷺ کا راستہ" اسی کے لئے حدیثوں میں لفظ سنت آیا ہے۔ (بلفظہ)

ان کی تشریح وتوضیح سے یہی سمجھ میں آرہا ہے کہ وہ لفظ سنت سے وہی معنی مراد لے رہے ہیں، جس کا مفصل مدلل بیان ملحوظات کے ضمن میں گذر چکا ہے یعنی وہ مشروع طریقہ جس کی اتباع وپیروی دین میں کی جاتی ہے، بالفاظ دیگر منہج نبوی، آپ ﷺ کی طرزِ زندگی جس میں اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق وغیرہ خواہ وہ فرض ہوں یا واجب وسنت اور مستحب وغیرہ سب ہی شامل ہیں یعنی مکمل شریعت۔

ظاہر ہے کہ لفظ سنت اس مذکور معنی میں شرعی احکام کے لئے دلیل وحجت نہیں ہوگا، کیونکہ شرعی احکام بلکہ پوری شریعت اپنے وجود وثبوت میں اللہ کے نبی ﷺ کے اقوال وافعال سے احتجاج واستدلال کی محتاج ہے، جب تک اس پر آپ ﷺ کے بیان کی مہر ثبت نہ ہوجائے، شرعی احکام کہے جانے کے مستحق نہیں ہوں گے تو پھر یہ کسی دوسرے حکم شرعی کے لئے دلیل وحجت کیسے بن سکتے ہیں، بلکہ صرف اور صرف وہی لفظ سنت احکام دین میں حجت ہوگا جس کی تعریف فقہائے اصول رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل اور تقریر سے کرتے ہیں، اس کے علاوہ لفظ سنت سے متعلق دیگر اصطلاحات واطلاقات اپنی تمام تر افادیت واہمیت کے باوصف باب احتجاج واستدلال میں مؤثر نہیں ہیں۔

لیکن آگے چل کر جہاں حدیث وسنت کی مثالیں پیش کی ہیں، اس سے یہ مفہوم ہورہا ہے کہ وہ "الطريقة المسلوكة" کو مواظبت، عمومی حالات میں معمول بہا کے معنی پر محمول کررہے ہیں؛ اسی لئے وہ امور جو نبی کریم ﷺ سے صرف ایک دوبار صادر ہوئے ہیں؛ انھیں حدیث کا اور جن پر برابر عمل رہا ہے، انھیں سنت کا نام دے رہے ہیں۔

اس مفہوم کے لحاظ سے یہ لفظ سنت فقہائے احناف کی اُس اصطلاحی سنت کے معنی میں ہوجائے گا جس کا درجہ خود آں موصوف نے واجب سے نیچے اور مندوب سے اوپر بیان کیا ہے، اور جس کی تعریف امام فخر الاسلام بزدویؒ نے "الطريق المسلوك في الدين" سے اور محقق ابن ہمامؒ نے "ما واظب على فعله مع ترك ما بلا عذر" کے الفاظ میں ذکر کی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس مفہوم کی رو سے بھی "سنت" احکام شرعی کی دلیل وحجت نہیں ہوگی، کیونکہ یہ تو بجائے خود ایک حکم شرعی ہے تو دیگر حکم شرعی کے لئے حجت کیونکر ہوگی، پھر اور آگے چل کر جب یہ فرماتے ہیں کہ "حدیث حجت نہیں سنت حجت ہے" تو ان کے اس قول سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ سنت کو علماء اصول کی اس سنت کے معنی میں مراد لے رہے ہیں، جس کو یہ فقہاء "ادلۂ اربعہ" کے ضمن میں بیان کرتے ہیں۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

زیر نظر اقتباس میں بھی غالباً سنت کو اسی سنت اصولیین کے معنی میں لے رہے ہیں اسی لئے اس کے مقابل حدیث کا ذکر کرتے ہیں، اور اس موقع پر جب یہ معنی مراد لینا صحیح نہیں ہے تو پھر اس چیلنج کی جو حقیقت ہے وہ معلوم ہے۔ عیاں راچہ بیان

کاش کہ فاضل محترم کی یہ تقریر، تقریر ہی کی حد تک رہ جاتی ضبط تحریر میں نہ آتی، کیونکہ اس حالت میں اس کا دائرۂ اثر محدود ہوتا؛ لیکن تحریر میں آجانے سے اس کا دائرہ وسیع بھی ہوگیا ہے اور پائیدار بھی، جس سے اوساط علمیہ میں فاضل محترم کی علمی شخصیت اور عرفی حیثیت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی ہے۔ نیز دیوبندی مکتب فکر کے عیب جویوں کو بیٹھے بٹھائے حرف گیری کا سامان دستیاب ہوجائے گا، اور ان سب سے زیادہ اندیشہ تو اس بات کا ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگوں کا ذہن وفکر اس کے پڑھنے کے بعد حدیثِ رسول ﷺ کے بارے میں منفی اثر قبول کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے، آمین۔

❁ ❁ ❁

تصحیحِ حدیثِ جساسہ

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرات علماء کرام وارباب مدارس زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بلاتمہید عرض ہے کہ چند ماہ پیشتر ایک حدیث کے طالب علم نے مجھ سے کہا کہ "تحفة الالمعی" شرح جامع ترمذی اردو میں حدیث جساسہ کو قطعاً ناقابل اعتبار بتایا گیا ہے، طالب علم کی اس بات پر مجھے تردد ہوا کہ "تحفة الالمعی" ایک ذمہ دار عالم کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس حدیث کو قطعاً ناقابل اعتبار لکھ دیں، وہ طالب علم کتاب لے آیا اور اس کی عبارت پڑھ کر سنایا، سن کر مجھے سخت تعجب ہوا کہ ایک ایسی حدیث جو سنن ثلاثہ میں موجود ہے، اور امام ترمذی نے اس کی تحسین وتصحیح کی ہے، مزید برآں یہ حدیث صحیح مسلم شریف میں بھی ہے، اور جن صاحب نظر محدثین نے صحیح مسلم کی تمام حدیثوں کی تحقیق کر کے اس کی بعض احادیث پر نقد کیا ہے یہ حدیث ان تنقید شدہ احادیث میں بھی نہیں ہے، پھر یہ کس طرح لکھ دیا گیا کہ یہ حدیث قطعاً ناقابل اعتبار ہے، اس حدیث پر یہ حکم لگانے کے لئے ایسی دلیل بھی نہیں ذکر کر رہے ہیں، جس طرح کی دلیل محدثین وعلماء کسی حدیث کی تضعیف وتغلیط کے لیے ذکر کرتے ہیں۔

اسی دوران ایک دن جامع رشید میں حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ سے ملاقات ہوگئی اور حدیث جساسہ کا ذکر آ گیا، اس وقت وہاں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی استاذ دارالعلوم بھی موجود تھے انھوں نے بتایا کہ صاحب تحفہ کی ایک نئی کتاب "علمی خطبات" کے نام سے آئی ہے، جس کی ایک تقریر میں حدیث وسنت کے درمیان فرق کرتے

ہوئے کہا گیا ہے کہ "حجت سنت ہے حدیث نہیں" نیز یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حدیث کے حجت ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے، ساتھ ہی موصوف نے یہ اطلاع دی کہ میں نے ان کی تقریر کا علمی جائزہ مرتب کیا ہے جو عنقریب انشاء اللہ شائع ہوجائے گا، اس پر حضرت مولانا ارشد مدنی صاحب نے فرمایا کہ ایسی بات لکھ کر انھوں نے کیسے شائع کردی، پھر بھی میری رائے ہے کہ آپ لوگ مولانا موصوف سے زبانی افہام وتفہیم کرلیں، مجھے توقع ہے کہ وہ اپنی بات سے رجوع کر کے اس کو مشتہر کردیں گے اور آئندہ ایڈیشن سے اسے نکال دیں گے۔

پھر مسئلہ کی نزاکت کو محسوس کر کے انھوں نے خود ہی دوڑ دھوپ کر کے اس وقت موجود کارگزار مہتمم حضرت مولانا غلام رسول خاموش صاحب مدظلہ کو آمادہ کیا کہ ہم سب کو جمع کر کے زبانی گفتگو کرادیں، پھر دو دن کے بعد حضرت مولانا سید ارشد صاحب کا فون آیا کہ کارگزار مہتمم صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے مولانا موصوف سے گفتگو کی وہ کہتے ہیں کہ میں ان کے دلائل دیکھ کر فیصلہ کروں گا، اگر مطمئن ہوگیا تو رجوع کر کے شائع کردوں گا۔

چونکہ حدیث جساسہ محدثین کے نزدیک صحیح ہے اور آج تک کسی محدث اور معتبر عالم نے اس کی تضعیف وتغلیط نہیں کی ہے صرف صاحب تحفۃ الالمعی کی یہ اپنی رائے ہے، اور جن وجوہ سے انھوں نے یہ رائے قائم کی ہے اس کو تفصیل کے ساتھ نمبروار کتاب میں درج کردیا ہے، اس لئے میں نے بھی صرف ان وجوہ کی نمبروار تردید پر اکتفا کیا ہے البتہ ساتھ ہی ان کے طریقۂ تغلیط، نیز موجودہ دور کے علماء کا فن حدیث میں کیا مقام ومرتبہ ہے اس جانب بھی توجہ دلائی ہے۔ پھر ایک تحریر میں نے اس وقت موجود حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم کو دی جس میں حضرت مولانا سید ارشد مدنی کی مساعی اور حضرت مولانا خاموش صاحب کی ہم سب کو ایک جگہ جمع کرنے پر آمادگی، نیز مولانا موصوف کا اس پر جواب سب واضح کردیا تھا۔

میری یہ مکمل تحریر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے ذریعہ موصوف تک پہنچی، حضرت مہتمم صاحب نے میری تحریر موصوف کے پاس بھیج دی اور اس تحریر کے ارسال کرتے وقت ایک مراسلہ میں یہ وضاحت فرمادی تھی کہ آپ اس تحریر کا جواب لکھ کر حضرت مولانا

خاموش صاحب کارگزار مہتمم کے حوالہ فرمادیں۔

کچھ دنوں کے بعد حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے مجھ سے فرمایا کہ مولانا موصوف کا کوئی جواب نہ مجھے ملا اور نہ ہی خاموش صاحب کو، اس سب کے بعد ابھی دو ہفتہ پہلے امتحان داخلہ کے موقع پر مولانا سید ارشد مدنی صاحب نے آں موصوف سے براہ راست گفتگو کی اور فرمایا کہ میرے نزدیک مناسب یہی ہے کہ باہم بیٹھ کر اس مسئلہ کا تصفیہ کرلیا جائے اور آپ بہتر سمجھیں تو میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھ جاؤں، مگر موصوف اس بار بھی ایک ساتھ بیٹھ کر افہام وتفہیم پر راضی نہیں ہوئے۔

اب جبکہ تقریباً ڈھائی تین ماہ کا عرصہ گذر گیا نہ موصوف کا کوئی تحریری جواب آیا اور نہ ہی باہم گفتگو پر راضی ہیں جبکہ معاملہ ایک ایسی صحیح حدیث رسول کا ہے جو ایک کے بجائے چار چار صحابہ یعنی حضرت فاطمہ بنت قیس، حضرت جابر، حضرت ابوہریرہ، حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے، ایسی حدیث کا انکار کیا جارہا ہے اور یہ انکار جن دلائل کی بنیاد پر کیا گیا ہے وہ دجّال سے متعلق دیگر احادیث کی تکذیب کا ذریعہ بن سکتا ہے جبکہ موجودہ دور میں گمراہ قسم کے لوگ دجال سے متعلق اکثر حدیثوں کا انکار کرتے ہیں اور آج کل یہ بحث اخبارات میں بھی آرہی ہے۔

حضرات علمار کرام، اب اسی قسم کی بات پہلی مرتبہ اس طرح آرہی ہے جس کی زد ہم سب پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتی، عوام، طلبۂ مدارس، بلکہ اہل علم کے بعض طبقات کا اس سے متاثر ہوجانے کا قوی اندیشہ ہے۔

اسی لئے حضرات ائمہ حدیث (اللہ ان کو جزائے خیر دے) طلبہ کو فتنہ سے محفوظ رکھنے کی غرض سے بدعت مفسقہ میں مبتلا شخص سے حدیث کی روایت کرنے سے منع کرتے ہیں، تاکہ طلبہ کا ان سے اختلاط نہ ہو لیکن ایسے راوی حدیث کے انتقال کے بعد ایسی روایت کو جس کی سند میں وہ ہوتا ہے قبول کرتے ہیں اور اس کی روایت سے منع نہیں کرتے کیونکہ اب اختلاط کا اندیشہ باقی نہیں رہا۔

عام مسلمانوں کو غلطی میں مبتلا ہونے سے بچانے کی غرض سے ضروری معلوم ہوا کہ

صاحب تحفۃ الالمعی کے موقف کی تردید شائع کردی جائے، اور ان کے فکر وفہم کی کوتاہی سے لوگوں کو آگاہ کردیا جائے اس لئے وہ تحریر جو بذریعہ حضرت مہتمم صاحب ان کو دی گئی تھی اس کی نقل شائع کی جارہی ہے۔

حضرات علمار کرام یہ فتنہ کا دور ہے، اس میں ہماری معمولی سی سہل پسندی سے بہت زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے لہٰذا ہم میں سے ہر ایک کے لیے ضروری ہے کہ احادیث رسول علی صاحبہا الصلاۃ والسلام پر جس طرف سے بھی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر حملہ ہو اس کی مدافعت کے لیے ہمہ وقت تیار رہیں۔ بالخصوص طلبۂ علوم دین کی تعلیم وتربیت اس نہج سے کریں کہ وہ اسلاف کے دامن سے وابستہ رہنے ہی کو سعادت باور کریں اور نئے زمانہ کی نئی تحقیقوں سے اپنے آپ کو دور رکھیں کیونکہ یہ تحقیقات بالعموم حق سے منحرف ہوتی ہیں۔

''الا ماشار اللہ''

وما ارید الا الاصلاح وما توفیقی الا باللہ وعلیہ توکلت والیہ انیب

نعمت اللہ

خادم التدریس دارالعلوم دیوبند

حدیث جساسہ کی تغلیط کی تردید

عبارت از اصل کتاب تحفۃ الالمعی جلد نمبر ۵، صفحہ نمبر ۶۲۷ مع جواب:-

تحفہ کی عبارت:

''اس روایت کا پہلا مضمون حضرت عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما نے رد کر دیا، اور احناف نے بھی اس کو نہیں لیا۔ اور دوسرا مضمون بھی اپنے داخلی اور خارجی تناقضات کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہے، یہ روایت اس کے تمام طرق کے ساتھ علامہ ابن کثیرؒ نے النہایہ (۹۳/۱) میں جمع کی ہے۔ اس کی روشنی میں اس روایت کے تناقضات درج ذیل ہیں:

(۱) امام مسلم نے کتاب الطلاق باب (۲) حدیث () میں متعدد طرق سے یہ روایت بیان کی ہے، ان کے شوہر ابوعمرو بن حفصؓ حضرت علیؓ کے ساتھ یمن کی طرف گئے تھے، اور وہاں سے انھوں نے حضرت فاطمہؓ کو تیسری طلاق بھیجی جو باقی رہ گئی تھی، اور شوہر کے کارندے نے عدت کے خرچ کے لیے جو پیش کیا، انھوں نے منظور نہیں کیا اور نبی ﷺ سے شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "لیس لك علیه نفقة" اور مسلم کی دوسری روایت ۲۹۴۲ میں یہ ہے کہ ان کے شوہر اسلام کے ابتدائی جہاد میں نبی ﷺ کے ساتھ شہید ہو گئے تھے، یہ دونوں باتیں متناقض ہیں۔'' انتہی

جواب: اس اعتراض کے سلسلے میں عرض ہے کہ حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کے شوہر کے طلاق دینے کے باب میں آپ کی ذکر کردہ روایات کے علاوہ بھی مختلف احادیث موجود ہیں، مگر آپ کا یہ قول: ''اس روایت کا پہلا مضمون حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ نے رد کر دیا ہے اور احناف نے بھی اس کو نہیں لیا ہے''، اس میں پہلے مضمون سے کیا مراد ہے، کیا مکمل واقعہ کا انکار، یا اس مضمون کے ایک جزء "لا نفقة لها ولا سكنى" کا؟ تو یہ بات روایات میں مصرح ہے کہ مکمل واقعہ کا انکار نہیں بلکہ اس کے ایک جزء اور ٹکڑے کے

رد اور انکار کا معاملہ ہے، اور وہ بھی اس بناء پر نہیں کہ حضرت فاطمہ کا قول لائق اعتبار نہیں تھا، بلکہ اس بناء پر کہ ان کے اس ٹکڑے کا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے معارضہ تھا، چنانچہ اسی مسلم شریف میں ہے: تحدث الشعبی بحدیث فاطمة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يجعل لها السكنى والنفقة، ثم اخذ الاسود كفا من حصى فحصبه به، فقال: ويلك! تحدث بمثل هذا، قال عمر: لا نترك كتاب الله وسنة نبينا صلى الله عليه وسلم بقول امرأة، لا ندرى لعلها حفظت او نسيت، لها السكنى والنفقة، قال الله تعالىٰ: لا تخرجوهن من بيوتهن، الاية، اسی طرح حضرت عائشہؓ سے مروی ہے: قالت: مالفاطمة خير ان تذكر هذا، تعنى قولها: "لاسكنى ولا نفقة".

الغرض ان صحابہ کا انکار صرف ایک ٹکڑے پر وارد ہوتا ہے اور وہ بھی محض معارضہ کی بناء پر کیوں کہ اس کو رد کرنے والے نے خود ہی اس کی صراحت کر دی ہے کہ ان کا یہ بیان حکم الٰہی سے متعارض ہے، لہٰذا اسے قبول نہیں کیا جا سکتا ہے، پھر حضرت فاروق اعظم نے ان کی اس بات کو رد کرنے کے ساتھ ان کے حفظ وفہم پر بھی آنچ نہیں آنے دی بلکہ اسے اپنے عدم علم پر محمول کر لیا۔ اس لیے حضرت فاطمہ کی اس روایت میں باہم تعارض واختلاف کا اثر ان کی دوسری روایتوں پر جن میں جساسہ کی روایت بھی شامل ہے، کیا پڑے گا؟ حدیث جساسہ کو قطعاً غلط بتانے کے لیے ان کی ذات کو معرض بحث میں لانا بجائے خود غلط ہے۔

تحفہ کی عبارت:

(۲) ''کتاب الطلاق کی روایت میں ہے کہ عدت کے بعد ان کے پاس حضرت معاویہؓ اور حضرت ابوجہمؓ نے منگنی بھیجی اور کتاب الفتن کی روایت میں ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے منگنی بھیجی''۔

(۳) ''کتاب الطلاق کی روایات میں ہے کہ نبی ﷺ نے عدت کے بعد حضرت اسامہ کی منگنی ڈالی، اور کتاب الفتن کی روایات میں ہے کہ پہلے منگنی ڈالی''۔ (انتہی)

جواب: اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جب کسی روایت میں کلمۂ حصر اور ماعدا کی نفی کا تذکرہ ہی نہیں ہے، تو حضرت معاویہؓ اور ابوجہمؓ کے پیغام نکاح دینے اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے پیغام دینے میں کیا تناقض ہے، کیا عدم ذکر عدم شئی اور ماعدا کی نفی کو مستلزم ہوتا ہے؟

اس اعتراض کے سلسلے میں یہ بتایا جائے کہ ''پہلے منگنی دینے'' کا مفہوم کتاب الفتن کی روایت کے کس جزء اور لفظ سے مترشح ہوتا ہے، کتاب الفتن کی روایت میں تو اس مفہوم کا کہیں ذکر نہیں ہے، البتہ بذریعہ واؤ عطف اس جملے کا ذکر پہلے ہے، جو عطف الجملہ علی الجملہ کے قبیل سے ہے، تو کیا واؤ ترتیب کا بھی متقاضی ہوتا ہے؟

بادی النظر سے پیدا شدہ اس طرح کے تناقضات کا شراح حدیث جواب بھی دیتے ہیں، پھر اگر بالفرض مذکورہ تناقضات حدیث کے اس پہلے مضمون میں ثابت بھی ہوں، تو ''حدیث جساسہ قطعاً قابل اعتبار نہیں ہے'' کے دعوے سے اس کو کیا تعلق ہے؟ کیا یہ باور کرانا مقصود ہے کہ حدیث کے ایک مضمون کا متناقض ہونا دوسرے مضمون پر بھی یقیناً اثر انداز ہوگا؟ اور اگر ان تناقضات کا ذکر محض پیدا کردہ احتمالات وتناقضات کی تعداد میں اضافہ کے پیش نظر ہے تو پھر اور بات ہے۔

اصل عبارت:

(۴) ''مسلم کی روایت میں یہ ہے کہ دجال سے ملاقات کا واقعہ خود حضرت تمیم داری کا ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: "حدثني انه ركب في سفينة بحرية مع ثلاثين رجلا من لخم وجذام"، اور مسلم ہی میں سیار ابوالحکم کی روایت میں ہے: "ان بني عم تميم الداري ركبوا في البحر" یعنی سفر میں حضرت تمیم داری کے عم زاد گئے تھے، خود حضرت تمیم نہیں گئے تھے، اور مسلم ہی میں یہ بھی ہے: "حدثني تميم الداري ان ناسا من قومه كانوا في البحر"، اور مسند احمد میں ہے: "اخبرني ان رهطا من بني عمه ركبوا في البحر" پس اگر صاحب واقعہ حضرت تمیم داری نہیں ہیں تو بیچ میں مجہول واسطے ہیں''۔

جواب: اس اشکال کے جواب میں عرض ہے کہ سیار ابوالحکم کی روایت میں آپ

نے یعنی کہہ کر: ''خود حضرت تمیم نہیں گئے تھے''، یہ کس عبارت کا ترجمہ کیا ہے؟ اس طرح کی بات تو کسی بھی روایت میں نہیں ہے، رہا راویوں کا کبھی حضرت تمیم اور کبھی بنوعم وغیرہ کو ذکر کرنے میں اختلاف تو یہ محض تعبیری اختلاف ہے، جب ایک روایت میں خود حضرت تمیم کے سفر میں جانے کا تذکرہ ہے تو ان روایات کا مجموعی مفہوم یہی ہوگا کہ ان کا یہ سفر اپنے چچازاد بھائیوں کی معیت میں ہوا تھا، ثقہ رواۃ کی روایات میں اس قسم کے تعبیری اختلاف میں شراح حدیث اسی طرح تطبیق دیتے رہے ہیں، لہٰذا مذکورہ تمام روایات باہم موافق ومطابق ہیں، ان میں زبردستی تعارض ظاہر کرکے یہ کہنا کہ ''روایت قطعاً قابل اعتبار نہیں ہے'' یہ پسندیدہ سعی نہیں کہی جاسکتی، بلکہ یہ حد درجہ غلط طریقہ ہے۔

آگے آپ نے فرمایا کہ: ''پھر اگر صاحب واقعہ خود حضرت تمیم داری نہیں تو بیچ میں واسطے مجہول ہیں'' آپ خود غور فرمائیں کہ اگر حضرت تمیم داری ہم سے یا آپ سے بیان کرتے، تو ہم آپ یہ بات کہہ سکتے تھے، کہ واسطے مجہول ہیں معلوم نہیں کہ وہ کون ہیں، ثقہ ہیں یا غیر ثقہ، اور واسطہ کی یہ جہالت مضر ہوتی، مگر یہاں تو حضرت تمیم براہ راست رسول اللہ ﷺ سے بیان کررہے ہیں، اور آپ ﷺ اس کی تصدیق وتائید فرمارہے ہیں، آپ ﷺ کی اس تصدیق وتائید کے بعد واسطوں کے معلوم یا مجہول ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کیا آپ ﷺ کی تصدیق کافی نہیں ہے؟

اصل عبارت:

(۵) ''یہ واقعہ صحابہ کو کس نے سنایا، نبی علیہ السلام نے یا خود حضرت تمیم داری نے؟ عام روایات میں یہ ہے کہ نبی علیہ السلام نے یہ واقعہ روایت کیا، مگر مسند ابویعلی میں ہے کہ خود حضرت تمیم داری کی زبانی آپ نے لوگوں کو یہ واقعہ سنوایا: قال: حدثني تميم، فراى تميما في ناحية المسجد فقال: يا تميم! حدث الناس ما حدثتني، قال: كنا في جزيرة، الخ'' (انتهى)

جواب: اس اشکال کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ مسند ابویعلی کی اس روایت میں آپ ﷺ کے فرمان ''حدثنی تمیم'' میں کوئی صراحت نہیں ہے کہ حضرت تمیم نے حضور صلی

اللہ علیہ وسلم سے کیا بیان کیا، بغیر ماحدث بہ کی صراحت ووضاحت کے دونوں روایتوں میں اختلاف وتعارض کیوں کرتسلیم کیا جاسکتا ہے؟ نیز ان دونوں روایتوں میں مجلس سماع کے تعدد کا بھی احتمال ہے، اس کے ہوتے ہوئے تعارض کیسے ہوگا؟ پھر اس واقعہ کو صحابہ سے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے حضرت تمیم داری نے آپ ﷺ کی موجودگی میں بیان کیا ہو، تو حضرت تمیم کے بیان کی تقریر آپ ﷺ سے ہوگئی، اب خود آپ ﷺ کے سنانے یا تمیم کے سنانے کے اختلاف سے نفس حدیث پر کیا اثر پڑے گا؟ علاوہ ازیں اس تعارض کو ثابت کرنے کے چکر میں آپ نے مسند ابویعلی کی اس روایت کے درجہ اور اس کے حکم کو بھی نظر انداز کردیا کہ یہ روایت "غریب جدًا" ہے، جمہور محدثین کے مذہب کے مطابق حدیثِ مسلم سے روایت مسند ابویعلی کا معارضہ نہیں ہوسکتا، کیوں کہ معارضہ کے لیے دونوں کا مساوی ہونا ضروری ہے، جبکہ صحیح مسلم اور مسند ابویعلی میں مساوات نہیں ہے، تو پھر صحیح مسلم کی حدیث کے مقابلہ میں اس غریب جداً روایت کے بارے میں آپ کا یہ معارضہ کیونکر درست ہوگا۔

اصل عبارت:

(۶) ''عام روایت میں ہے "انطلقوا إلى هذا الرجل بالدير"، دیر کے معنی ہیں راہب خانہ، عیسائی درویشوں کی خانقاہ، اور ابوداؤد کی روایت (۴۳۲۵) میں ہے: اذهب إلى ذلك القصر، اور قصر کے معنی ہیں محل''۔ (انتهى)

جواب: جب آپ کو یہ تسلیم ہے کہ عام روایات میں ''دیر'' کا لفظ ہے، اور ابوداؤد کی روایت میں ''قصر'' کا، تو اس اختلافِ لفظ سے روایت کی صحت پر کیا اثر پڑے گا؟ اس عمارت کے معبد ہونے کا لحاظ کرکے اسے ''دیر'' سے تعبیر کیا گیا ہے جو بالکل درست استعمال ہے، اور اس ''دیر'' کے عظیم ووسیع ہونے کے اعتبار سے اسے ''قصر'' کہہ دیا گیا، کیوں کہ قصر کا لغوی معنی "بيت فخم واسع" ہے، آخر اس میں کیا سبب ضعف ہے کہ اسے بھی وجوہ ضعف میں شمار کیا گیا ہے؟ پھر اگر دونوں لفظ آپ کے بقول باہم متناقض ومتعارض ہیں، تو اس ایک لفظِ متعارض کی وجہ سے کس اصول کی بناء پر پوری حدیث قطعاً

ناقابل اعتبار ہوجائے گی؟

اصل عبارت:

(۷) ''اگر یہ روایت صحیح ہے تو ابن صیاد کی جانچ والی روایت بے معنی ہوجاتی ہے، حالانکہ ابن صیاد والی روایت متفق علیہ ہے، اور اس روایت کے دونوں مضمون صرف مسلم میں ہیں، امام بخاری نے صرف الخ'' (انتہی)

جواب: سوال یہ ہے کہ حدیث جساسہ کے صحیح ہونے کی صورت میں ابن صیاد کی جانچ والی روایت کے بے معنی ہونے کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے اس کی کوئی وضاحت نہیں فرمائی، اور شاید آپ اس کو بیان کرنا بھی نہیں چاہتے اس لیے کہ اگر اس کو بیان کرتے تو بے معنی کہنے کی لغویت خود واضح ہوجاتی، اس ساتویں اعتراض کے جواب میں چند باتیں عرض ہیں:

(۱) جب آپ نے یہ تحریر کردیا کہ ''حدیث جساسہ بعد کی ہے، اس لیے کہ تمیم داری ۹ھ میں مسلمان ہوئے اور مدینہ آکر حدیث بیان کیا''، یعنی ابن صیاد کے دجالِ اکبر ہونے نہ ہونے کے سلسلے میں جانچ اور تحقیق پہلے کی بات ہے، حدیث جساسہ کے بعد جب معلوم ہوگیا کہ دجالِ اکبر تو ایک جزیرہ میں مقید ہے، تو پھر ابن صیاد کے سلسلے میں کوئی تحقیق نہیں کی، یہ بات لکھ کر آپ نے اس مذکورہ بنیاد پر حدیث جساسہ کے غلط ہونے کے احتمال کو باطل کردیا تو پھر اس کو وجوہِ ضعف میں ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟

(۲) تغلیطِ حدیث کے لیے وجہِ تغلیط کا حتمی ہونا ضروری ہے، اور آپ نے مذکورہ بالا وجہ کو خود ہی احتمال کے درجہ میں بیان کیا ہے، یعنی اگر جساسہ پہلے کی ہو تو ابن صیاد والی روایت بے معنی ہوگی ورنہ نہیں، تو کیا اس احتمالی وجہ سے حدیث صحیح کی تغلیط ہوسکتی ہے؟

(۳) آپ نے حدیث جساسہ کے قطعاً ناقابلِ اعتبار، اور حدیث ابن صیاد کے صحیح ہونے کی ایک دلیل یہ بیان کی ہے کہ ابن صیاد کی روایت متفق علیہ ہے، اور جساسہ کی روایت صرف مسلم میں ہے، امام بخاری نے حدیث کے اس جزء کو بیان نہیں کیا ہے، تو کیا امام بخاری کا کسی حدیث کی تخریج نہ کرنا اس حدیث کی تغلیط کے لیے کافی ہے؟ خود امام

بخاریؒ یا کسی محدث نے اس طرح کی بات کہی ہے؟ امام بخاریؒ تو اس بات کے مدعی ہیں کہ جن احادیث کی میں نے تخریج کی ہیں وہ صحیح ہیں، البتہ تمام روایاتِ صحیحہ کی تخریج کے وہ قطعاً مدعی نہیں ہیں، لہٰذا ان کے عدمِ اخراج سے اس حدیث کی صحت غبار آلود نہیں ہوگی۔

(۴) یہ بات تقریباً متعین ہے کہ حدیث جساسہ، ابن صیاد کی جانچ والی روایات کے بعد کی ہے، مگر پھر بھی اس کی تغلیط کے لیے آنجناب فرماتے ہیں: کہ ''اس واقعہ کے بعد (حدیث جساسہ کے بعد) صحابہ آخر تک ابن صیاد کے بارے میں شک میں کیوں مبتلا رہے؟ اس واقعے کے بعد تو ان کا ذہن صاف ہوجانا چاہئے تھا''، آہ، صحابہ کے ذہن صاف نہ ہونے کی آپ نے کوئی وضاحت نہیں فرمائی، اسی طرح آپ نے ''صحابہ آخر تک شک میں کیوں مبتلا رہے'' کا لفظ استعمال کیا ہے، تو کیا تمام صحابہ کا یہ حال تھا یا بعض کا؟ اور جن کا ذہن صاف نہیں تھا ان کو حدیث جساسہ معلوم تھی یا نہ تھی؟ اس بابت آپ نے کوئی تفصیل بیان نہیں کیا، بلکہ آپ نے تو صحابہ کے اس شک کو بھی ظاہر نہیں فرمایا جو حدیث جساسہ سے زائل ہوجانا چاہئے تھا، اور اس طرح کی مبہم باتوں سے حدیث صحیح کی تغلیط پر آمادہ ہیں۔

(۵) صحابۂ کرام میں حضرت جابر اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما یہ کہتے تھے کہ ابن صیاد وہی ہے جو آگے چل کر دجالِ اکبر ہوگا، اور دوسرے حضرات اس پر مطمئن تھے کہ ابن صائد وہ دجالِ اکبر نہیں ہے جو اپنے وقتِ موعود پر ظاہر ہوگا، بلکہ دونوں الگ الگ ہیں، چنانچہ حضرت جابرؓ کی روایت ابوداؤد شریف میں ہے، جس کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں حدیث حسن کہا ہے، اس روایت میں واقعۂ جساسہ کا بیان بھی ہے اور راوی حدیث ابوسلمہ کہتے ہیں "شهد جابر أنه هو ابن الصائد، قلت: فإنه قد مات، قال: وإن مات، قلت: فإنه قد أسلم، قال: وإن أسلم، قلت: فإنه قد دخل المدينة، قال: وإن دخل المدينة. جب صحابہ کا یہ حال تھا تو پھر ''صحابہ آخر تک'' الخ کی بات کیا معنی رکھتی ہے؟

(۶) کسی حدیث کی صحت کے لیے یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اس کے

مضمون سے مطمئن ہوجائے، تو اس عدم اطمینان کو وجوہ تغلیط میں بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

(۷) اگر آپ کے قول کے بموجب حدیثِ جساسہ کے باوجود صحابہ کا ذہن صاف نہیں ہوا، اس لیے حدیث جساسہ غلط ہے، تو ہم پوچھتے ہیں کہ یہ علت تو ان تمام احادیث میں موجود ہے جن سے دجال کی شخصیت متعین ومشخص ہوجاتی ہے، تو اس سے صحابہ کا ذہن مطمئن ہوجانا چاہئے تھا مگر ان روایات کے باوجود صحابہ کا ذہن مطمئن نہیں ہوا جیسا کہ آپ کے قول: ''صحابہ آخر تک شک میں'' الخ سے ظاہر ہوتا ہے، تو آنجناب ان روایات کے بارے میں کیا ارشاد فرمائیں گے؟

اصل عبارت:

(۸) اور روایت کا یہ جملہ تو عجیب ہے: لا ندری ما قبلها من دبرها، یعنی اس کی قبل اور دبر میں ہم امتیاز نہیں کر پا رہے تھے، حالانکہ یہ دونوں اعضاء جانوروں میں عام طور پر ساتھ ساتھ ہوتے ہیں، ہاں اگر راوی کہتا کہ اس کا منہ کدھر تھا اور دم کدھر تھی، اس کا پتہ نہیں چل رہا تھا، تو ایک بات تھی۔ انتہی

جواب: اس روایت کے جملہ "لاندری ما قبلها من دبرها" پر آں جناب کا اظہار تعجب عجیب ہے، کیوں کہ اس جملہ کا صاف مطلب یہ ہے کہ بالوں کے طول اور کثرت کی وجہ سے اس جانور کا آگا پیچھا پتہ نہیں چل رہا تھا، قبل اور دبر کا استعمال آگے پیچھے کے معنی میں بھی ہوتا ہے صرف عضو مخصوص ہی میں نہیں، اکثر روایات میں: "لا يدرون أرجل هو أم امرأة" کے الفاظ آئے ہیں، تو جب بالوں کی کثرت کی وجہ سے اس کے مذکر ومؤنث کی تمیز نہیں ہو پا رہی تھی، تو پھر یہ کیسے فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس کے قبل ودبر نظر آنے کے باوجود ان دونوں میں امتیاز مشکل ہو رہا تھا، اور اگر یہ جملہ بالفرض عجیب ہو بھی تو کیا یہ چیز پوری حدیث کے قطعاً ناقابل اعتبار ہونے کے لئے کافی ہوجائے گی؟

اصل عبارت:

(۹) نیز یہ لوگ بڑے مضبوط دل کے تھے کہ نہ جساسہ سے خوفزدہ ہوئے نہ دجال

سے، بڑے اطمینان سے دونوں سے باتیں کرتے رہے، حالانکہ ایسی صورت میں انسان حواس باختہ ہوجاتا ہے اور چھٹی گم ہوجاتی ہے۔ (انتہی)

جواب: اولاً یہ بتایا جائے کہ بالکل خوف زدہ نہ ہونے اور مکمل اطمینان کی بات روایت کے کس جزء سے معلوم ہورہی ہے؟ پھر جب تمیم داری کے رفقاء سفر کی تعداد تقریباً تیس تھی، تو اس بڑی جماعت کا جساسہ سے خوف زدہ نہ ہونا قرین قیاس ہے، ہاں اگر ایک یا دو افراد ہوتے تو اس عجیب وغریب جانور سے خوف زدہ ہوکر حواس باختہ ہوجانے کی بات کہی جاسکتی تھی، علاوہ ازیں صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں: "لما سمت لنا رجلا فرقنا منها" جس سے معلوم ہورہا ہے کہ وہ لوگ دوران گفتگو پورے اطمینان سے نہیں تھے بلکہ ایک حد تک خوف زدہ بھی تھے تو اپنی جانب سے بالکل خوف زدہ نہ ہونے اور بڑے اطمینان کے ساتھ الخ کا اضافہ کرکے روایت کی تغلیط کیا پسندیدہ عمل کہا جاسکتا ہے؟

اصل عبارت:

(۱۰) حضرت تمیم داری وہ صحابی ہیں جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمعہ سے پہلے بیان کی اجازت ملی تھی.... اگر یہ واقعہ خود حضرت تمیم داری کا تھا تو ایسا عجیب واقعہ مقرر بار بار بیان کرتا ہے الخ (انتہی)

جواب: عرض ہے کہ کیا کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لیے، خواہ اسی میں کوئی عجیب بات ہو، یہ بھی ضروری ہے کہ اسے بار بار بیان کیا جائے؟ اور اگر حدیث کی صحت کے لیے محدثین کے یہاں یہ شرط بھی ملحوظ ہے تو اس کی نشان دہی کی جائے، محض اپنی جانب سے شرائط کا اضافہ کرکے کسی صحیح حدیث کو غلط نہیں کہا جاسکتا۔

جہاں تک حضرت فاطمہ بنت قیس کے تفرد کا ذکر ہے تو اس سلسلے میں حافظ الدنیا کی درج عبارت ملاحظہ ہو: وقد توهم بعضهم ان حديث فاطمة بنت قيس فى قصة تميم فرد، وليس كذلك، فقد رواه مع فاطمة بنت قيس ابوهريره وعائشة وجابر رضى الله عنهم.

اما حديث عائشة فهو حديث فاطمة المذكور عن الشعبى، قال: ثم

لقيت القاسم بن محمد فقال: اشهد على عائشة حدثنى كما حدثت فاطمة بنت قيس.

واما حديث جابر فاخرجه ابو داؤد بسند حسن.

واما حديث فاطمة بنت قيس فاخرجه مسلم، وابوداؤد بمعناه، والترمذى وابن ماجه، وقال الترمذى: حسن صحيح الى آخره. ان سب باتوں کے بعد بھی کیا تفرد ہونے کی بات درس ہوگی؟

اصل عبارت:

(۱۱) اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آباد جزیرہ کا وہاں پورا گاؤں بسا ہوا تھا۔ اب ذرائع معلومات وسیع ہوگئے ہیں آخر یہ جزیرہ کہاں ہے؟

جواب: یہ عجیب وغریب سوال ہے جس کی بناء پر حدیث کی تغلیط فرمائی جارہی ہے۔ کیا اسی طرح کی باتیں ملحدین اور مستشرقین نے قرآن میں بیان کردہ قوموں اور اس میں ذکر کردہ مقامات کی بابت کہہ کر قرآن کی تغلیط نہیں کی ہے۔ کیا اس کی وجہ سے قرآن کی تغلیط کردی جائے گی۔ اس کے بعد آنجناب کا ارشاد ہے "اور وہ لوگ جب راستہ بھول گئے تھے تو اس جزیرہ سے واپس کیسے لوٹے ہیں"۔ کیا حدیث کی صحت اس بات پر موقوف ہے کہ معلوم ہو کہ کیسے لوٹے۔

گذارش

"النصح للمسلم" کے طور پر میرے ذہن میں دو تین باتیں تھیں، جن پر بالمشافہ آپ کی توجہ مبذول کرانا مناسب سمجھتا تھا مگر زبانی گفتگو پر آپ کی عدم آمادگی کے سبب مجبوراً بذریعہ تحریر وہ باتیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

۱- کسی حدیث کو غلط قرار دینے کے دو طریقے ہیں، ایک طریقہ جمہور علماء ومحدثین کا ہے، جو اصول حدیث کی کتب میں بالتفصیل مذکور ہے۔ دوسرا طریقہ منکرین حدیث، ملحدین اور معتزلہ وغیرہ کا ہے، جس میں خود ساختہ تناقضات اور اپنی عقل کے خلاف پر مبنی اعتراضات

پر ہوتا ہے، جو شخص جس فریق کا طریقہ اختیار کرتا ہے، بالآخر انھیں میں جاملتا ہے۔

۲- اللہ جل شانہٗ کے فضل وکرم سے ہم ایک ایسے ادارے سے وابستہ ہیں، جس کے متعلقین کے لیے اہل سنت والجماعۃ اور حنفی المسلک ہونے کے ساتھ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہما کا ہم مشرب ہونا بھی ضروری ہے، حتیٰ کہ اس ادارے سے اکتساب فیض کرنے والے طلبہ سے بھی بوقت داخلہ اس کا عہد لیا جاتا ہے، ایسے میں اگر آپ کی کوئی تحقیق ان حضرات کے نظریہ کے خلاف ظہور میں آتی ہے، تو ایمانداری اور دیانت کا تقاضہ یہی ہے کہ آپ پہلے اس ادارے کے مشرب ونظریہ کے محافظوں کی خدمت میں وہ تحقیق پیش کرنے کے بعد بیان کریں یا شائع کریں، خاص طور پر اگر وہ تحقیق جمہور امت کے نظریہ کے خلاف ہو تو یہ ذمہ داری مزید اشد ہو جاتی ہے۔

(ز) ۳- حضرات ائمہ حدیث کا یہ متفقہ طرز عمل ہے کہ وہ کسی حدیث کی تضعیف وتصحیح ظن غالب کی بنیاد پر کرتے ہیں حتیٰ کہ کسی حدیث پر وضع کا حکم بھی غالب ظن کی بنیاد ہی پر لگاتے ہیں، جبکہ حدیث جساسہ کے ناقابل اعتبار ہونے کو آپ قطعیت کے ساتھ بیان کررہے ہیں، عرض ہے کہ حدیث رسول ﷺ کا معاملہ بڑا نازک ہے، اس لیے حدیث پاک پر گفتگو کے وقت اس کی نزاکت کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے، تھوڑی سی بے توجہی سے آدمی خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق ہو جاتا ہے۔ اعاذنا اللّٰہ منہ.

والسلام والعاقبة للمتقين

❁ ❁ ❁

تصحیح جسّاسہ حدیث

ایک معاصر کے حدیث جساسہ کو قطعاً ناقابل اعتبار
ٹھہرانے کا اصول محدثین کی روشنی میں مکمل تردید

از
مولانا نعمت اللہ صاحب استاذ حدیث
دارالعلوم دیوبند

ناشر
مکتبة النعمة، دیوبند سہارنپور یوپی

تشریح: یہ حدیث قتادہ رحمہ اللہ امام عامر شعبی رحمہ اللہ سے، اور وہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں، اور مسلم شریف (حدیث ۲۹۴۲ کتاب الفتن) میں قتادہ کے چار متابع ہیں: عبداللہ بن بریدۃ، غیلان بن جریر، ابوالزناد اور سیار ابوالحکم، یہ چاروں حضرات بھی امام شعبی سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں، پس یہ متابعتِ تامہ ہے۔ اور ابوداؤد (حدیث ۴۳۲۵ کتاب الملاحم) میں ابوسلمہ اور مجالد بن سعید کی روایت ہے، یہ دونوں بھی حضرت فاطمہؓ سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں۔ پس یہ دونوں عامر شعبیؒ کے متابع ہیں۔ اور ابوداؤد (حدیث ۴۳۲۸) میں ابوسلمہ حضرت جابرؓ سے بھی یہ حدیث روایت کرتے ہیں، پس یہ حضرت فاطمہؓ کی حدیث کے لئے شاہد ہے، اس لئے یہ روایت سند کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اس کی تصحیح کی ہے۔

یہ روایت ترمذی، مسلم اور ابوداؤد کے علاوہ اور کتابوں میں بھی ہے۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نهاية البداية والنهاية (جلد اول، صفحہ ۹۲) میں اس حدیث کو اس کے تمام طرق کے ساتھ جمع کیا ہے۔ وہاں حاشیہ میں کتاب کے محقق شیخ محمد فہیم ابوعبیہ (رئیس بعثة الأزهر الشريف بلبنان) نے اس حدیث پر سخت تنقید کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

هذا الحديث عليه طابع الخيال وسمة الوضع، الأمر الذى يجعلنا تنفى صدوره عن الرسول عليه السلام، الذى لايقول إلا الحق، ولا ينطق عن الهوى، ولو صح صدوره عن الرسول، وعلى المنبر، وفى حشد من الصحابة الكرام: لتوا تر نقله، واتفقت كلمة الرواة على روايته، ولكان فى إطار الحكمة النبوية الهادية، والكلمة المحمدية الحق، ولما كان على ما هو عليه، ولا على بعض منه.

مگر ابوعبیہ صاحب کی یہ تنقید محدثین کے اصول کے مطابق نہیں، اس تنقید پر خیال کی چھاپ ہے، اور جو بات منبر سے کہی جائے اس کا تواتر کے ساتھ منقول ہونا ضروری نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حدیث إنما الأعمال بالنيات منبر پر خطبۂ جمعہ میں بیان کی تھی، مگر یحییٰ بن سعید انصاری رحمہ اللہ تک اس کی ایک

ہی سند ہے، اور روایت بالمعنی کی صورت میں تو راویوں میں الفاظ کا اختلاف ہو ہی جاتا ہے، پس یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ اس کی وجہ سے حدیث کو موضوع قرار دیا جائے۔

البتہ دو باتیں وضاحت طلب ہیں:

پہلی بات: اگر کوئی یہ سوال کرے کہ وہ جزیرہ جس میں دجال قید ہے: کہاں ہے؟ اب تو انسان کے ذرائع معلومات وسیع ہو گئے ہیں، اور جغرافیہ دانوں نے زمین کا چپہ چپہ چھان مارا ہے!

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اب تک انسان کی رسائی سمندروں کے تمام جزائر تک نہیں ہوئی، صرف فیجی کے ایک ہزار جزائر ہیں، ان میں سے چند جزیروں تک ہی لوگ پہنچے ہیں۔

دوسری بات: دجال والی روایت میں اور ابن صیاد والی روایت میں یک گونہ تعارض ہے، اور تطبیق مشکل نظر آتی ہے۔ بذل المجهود (۱۲:۳۸۹ طبع جدید) میں ہے: قلت: واعلم أن قصة ابن صياد وقصة الدجال في غاية الإشكال والاشتباه إلخ اشکال یہ ہے کہ اگر دجال کسی جزیرہ میں قید ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صیاد کا امتحان کیوں کیا؟ اس اشکال کے دو جواب ہیں:

پہلا جواب: ابن صیاد کے امتحان کی روایت مقدم ہے، اور حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کی روایت مؤخر ہے، کیونکہ آپؓ سنہ ۹ ہجری میں مسلمان ہوئے ہیں۔

دوسرا جواب: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری (۱۳:۳۲۸) میں دیا ہے کہ حقیقی دجال تو وہی ہے جس کو تمیم داری رضی اللہ عنہ نے دیکھا ہے، اور ابن صیاد ایک شیطان تھا جو دجال کی صورت میں ظاہر ہوا تھا، اس لئے اس کی جانچ کرنی پڑی، مگر کوئی واضح بات سامنے نہ آئی۔

ملحوظہ: پہلے تحفۃ الالمعی (۵:۶۲۸-۶۳۰) میں حدیث کی جو تشریح کی گئی تھی وہ صحیح نہیں تھی، وہ نہایہ والے حاشیہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی، پھر غور کرنے پر اس کی سخافت ظاہر ہوئی تو وہ ساری تشریح حذف کر دی گئی، اور اس کی جگہ یہ نئی تشریح لکھی گئی۔

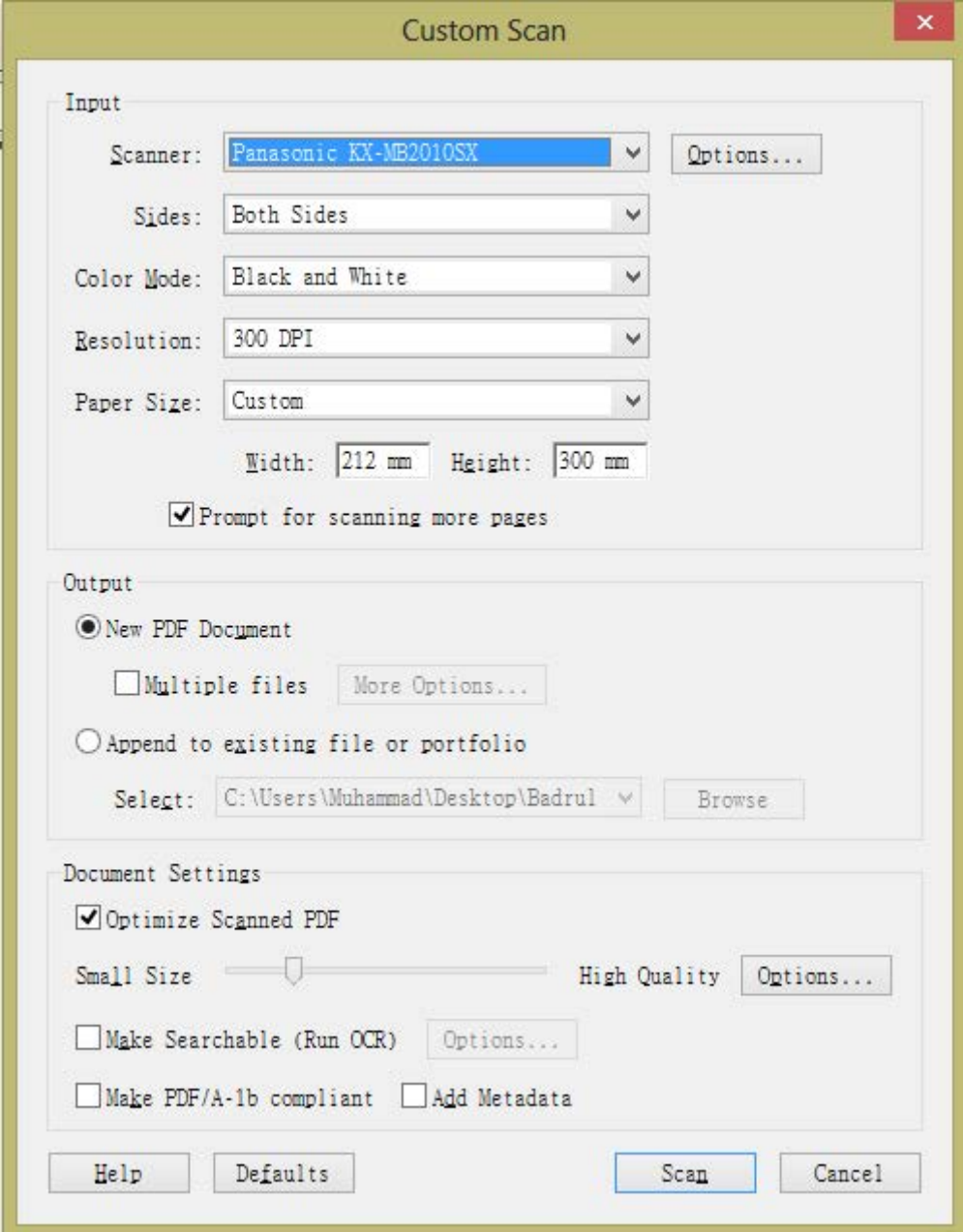
Custom Scan
Input
Scanner:
Panasonic KX-MB2010SX
Options...
Sides:
Both Sides
Color Mode:
Black and White
Resolution:
300 DPI
Paper Size:
Custom
Width:
212 mm
Height:
300 mm
Prompt for scanning more pages
Output
New PDF Document
Multiple files
More Options...
Append to existing file or portfolio
Select:
C:\Users\Muhammad\Desktop\Badrul
Browse
Document Settings
Optimize Scanned PDF
Small Size
High Quality
Options...
Make Searchable (Run OCR)
Options...
Make PDF/A-1b compliant
Add Metadata
Help
Defaults
Scan
Cancel